مئی سنہ ۶۱ء

نگار

سالانہ چندہ

ہندوستان و پاکستان

دس روپے

قیمت فی کاپی

ہندوستان

پچھتر پیسے

پاکستان

۱۲/

نگار

افسوس ہے
مشین کی خرابی کی وجہ سے یہ پرچہ چار دن لیٹ شائع ہو رہا ہے۔

اغلاطِ آتشِ گل
کے عنوان سے آتشِ گل پر اڈیٹر نگار کا بسیط تبصرہ جولائی میں شائع ہوگا

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

چالیسواں سال | فہرست مضامین مئی ۱۹۶۱ء | شمارہ ۵

ملاحظات ۳
اسلام اور جمہوریت ... نیاز فتحپوری ... ۲
جدید ایرانی شاعری کا سیاسی پس منظر ... آفتاب اختر ... ۱۴
جہا بھارت پر ایک تحقیقی نظر ... نواب سید حکیم احمد ... ۲۱
آسودگانِ خاک ..... شیخ تصدق حسین ... ۲۶
بازنطینی دورِ حکومت کی تاریخ کا ایک پوشیدہ ورق .. نیاز فتحپوری ۲۹
باب الاستفسار ... (۱) وحید احمد خاں اور مولانا آزاد
(۲) گنڈہ یا غنڈہ ۳۳
(۳) مسئلہ رویتِ ہلال اور پاکستان
امیر معاویہ کا دربار ... نیاز فتحپوری ... ۳۹
ایک سرزمین جہاں شوہر فروخت ہوتا ہے ... نیاز فتحپوری ... ۴۹
لکھنؤ کے افیونی ..... شوکت تھانوی ۲۵
کرۂ زمین کی آئندہ حکمراں قوم ... نیاز فتحپوری ... ۴۹
اشارات و کنایات ..... نیاز فتحپوری ۵۱
منظومات :- جسونت رائے رعنا بلسوی
حیات لکھنوی .....
خلیل شارق نیازی۔
متین نیازی۔ اکرم دھولیوی ۵۴

ملاحظات

ہمارا نظامِ تعلیم اور اس کا پست معیار

اس میں شک نہیں برطانوی دورِ حکومت سے پہلے ہندوستان میں تعلیم کا رواج بہت کم تھا، چند مخصوص خاندانوں میں تو البتہ اس کو بڑی ضروری سمجھتا تھا، لیکن عوام قریب قریب سب اس سے محروم تھے۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد جب سرکاری مدارس شہروں میں قائم ہوئے اور متوسط طبقہ نے محسوس کیا کہ حصولِ ترقی کے لئے انگریزی پڑھنا ضروری ہے تو تعلیم میں کچھ وسعت پیدا ہوئی اور ان پڑھ لوگوں کا اوسط کم ہوتا گیا، لیکن انتہائی ترقی کے بعد بھی یہ سب کچھ نہ ہونے کے برابر تھا۔

کہا جاتا ہے اس کا سبب صرف یہ تھا کہ حکومت غیر ملکی تھی اور وہ طبقۂ عوام میں تعلیمی بیداری کو اپنے لئے مفید نہیں سمجھتی تھی۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ پہلے تعلیمی تناسب یہاں بہت گرا ہوا تھا اور آزادیِ ہند کے بعد اس تناسب میں نمایاں اضافہ ہوگیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس تعلیم سے ملک کو کیا فایدہ پہونچا؟ اس کا جواب بہت مایوس کن ہے۔

آزادیِ ہند سے قبل آبادی کا اکثر حصہ اسکول تک پہونچ کر اپنی تعلیم ختم کر دیتا تھا اور ہزار میں دو ہی چار ایسے ہوتے تھے جو کالجوں تک پہونچ پاتے تھے۔ برخلاف اس کے آج ہر سال لاکھوں طلبہ ایف اسکول کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں۔ ہزاروں کالج

سے ڈگری لے کر نکلتے ہیں - لیکن حالت یہ ہے کہ اگر آپ ان کا مقابلہ اب سے ۳۰-۴۰ سال قبل کے طلبہ سے کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُس زمانہ کا میٹرک پاس شدہ طالب علم موجودہ زمانہ کے گریجویٹ جوانوں سے زیادہ قابل و باخبر ہوتا تھا - بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے تاہم اس کا کوئی سبب ہونا چاہئے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آزادی ہند کے بعد سے ہمارا معیار تعلیم برابر پست ہوتا چلا جا رہا ہے اور محکمۂ تعلیم روپیہ تو بے شک خرچ کرنا جانتا ہے، لیکن اس کے صحیح صرف سے بالکل غافل و بے خبر ہے۔

تعلیم کا حقیقی مقصود یہ نہیں کہ چند مخصوص کتابیں پڑھ کر امتحان پاس کر لیا جائے بلکہ تعلیم سے مراد تربیت ذہن و اخلاق ہے سو اس کا حال یہ ہے کہ پستی اخلاق کی جتنی مثالیں آج کل ہم کو موجودہ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ملتی ہیں اتنی بازاری طبقوں میں بھی نظر نہیں آتیں۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ آج ہمارے اکابر قوم جب درسگاہوں کے اجتماع میں طلبہ سے خطاب کرتے ہیں تو وہ انھیں قوم کا مستقبل، ملک کی آیندہ ترقی کا ذمہ دار بتاتے ہیں، لیکن انھیں خبر نہیں یا اگر خبر ہے تو وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتے کہ موجودہ نسل کی طرف سے یہ توقعات قایم کرنا کس قدر لغو و غلط بات ہے کیونکہ سرے سے ہمارا نظام تعلیم ہی ایسا نہیں کہ طلبہ سوچ سکیں کہ ان کے صحیح فرایض کیا ہیں اور وہ کیونکر اچھے متمدن انسان بن سکتے ہیں۔

سب سے پہلی چیز جو نظام تعلیم کو مفید بنا سکتی ہے وہ صحیح نصاب کی تعیین ہے اور اسی کے ساتھ قابل و فرض شناس اساتذہ کا انتخاب اور ہمارے یہاں سرے سے یہی دونوں چیزیں مفقود ہیں۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ ابتدائی درجوں ہی میں کمسن طلبہ پر متعدد علوم و فنون کا بار ڈال دیا جاتا ہے، حالانکہ اس سے مقصود صرف چند اصطلاحات کے رٹا دینے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا حالانکہ علوم و فنون کے سکھانے کے لئے ضرورت عملی تعلیم کی ہے اور اس کا التزام کسی اسکول میں نہیں۔

اب رہا بلندی اخلاق کا سوال، سو اول تو یہ چیز نصاب میں شامل ہی نہیں ہے اور اگر کوئی لٹریچر اس نام سے پڑھایا جاتا ہے تو وہ فراخدلی پیدا کرنے کی جگہ طلبہ کو اور زیادہ تنگ نظر بنا دینے والا ہے، کیونکہ اس سلسلہ میں جو قومی و تاریخی روایات پڑھائی جاتی ہیں ان میں اکثر دور و اہمہ پرستی سے تعلق رکھتی ہیں۔

یہ زمانہ سائنسی علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنے کا ہے اور ملک کی معاشی حالت اسی وقت دور ہو سکتی ہے جب ہر شخص اپنی جگہ اپنے عمل سے روزی کمانے کا اہل ہو، لیکن ہمارا نظام تعلیم اس مقصد کی تکمیل کے منافی ہے۔

ہر سال لاکھوں نوجوان اسکولوں اور کالجوں سے نکلتے ہیں اور سب کے سب یہی چاہتے ہیں کہ انھیں کوئی نوکری مل جائے اور یہ چاہنا ان کا بالکل حق بجانب ہے کیونکہ ان کو تعلیم ہی ایسی ملی ہے کہ ہمیشہ دوسروں کے محتاج رہیں - پھر اگر دنیا کی کوئی حکومت ملک کے تمام تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ملازمت دینے کی ذمہ دار ہو نہیں سکتی (اور یقیناً نہیں ہو سکتی) تو پھر اس کو سوچنا چاہئے کہ ملازمت کے علاوہ حصول معاش کے اور کیا ذرایع ہو سکتے ہیں اور ان ذرایع کی فراہمی حکومت کا فرض ہے یا نہیں - آج ایک چپراسی کی جگہ خالی ہوتی ہے تو اس کے لئے سیکڑوں گریجویٹ درخواست لے کر پہونچ جاتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ جوتا صاف کر کے یا صابون بیچ کر اپنی روزی کمائے - افسوس ہے کہ جو غلامانہ ذہنیت آزادی سے پہلے پائی جاتی تھی، آزادی کے بعد بھی بدستور باقی ہے اور یہ نتیجہ ہے صرف غلط تعلیم کا۔

حکومت کو سوچنا چاہئے کہ وہ اس طرح ہندوستان کی آبادی میں ہر سال کتنے غیر مطمئن و پریشاں خیال نوجوانوں کا اضافہ کرتی چلی جا رہی ہے اور اگر وہ بقاء حیات کے لئے غیر آئینی و مجرمانہ ذرایع اختیار کرنے پر آمادہ ہیں تو یقیناً ان کو قابل الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں حکومت کو بہت کچھ کرنا ہے۔ نصاب، طریق تعلیم، انتخاب اساتذہ، اصول امتحان و معیار کامیابی وغیرہ سب پر غور کرنے کی ضرورت ہے نیز یہ کہ تعلیم کو عام کرنے کی جگہ اس کو مفید و کارآمد بنانا زیادہ ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب تمام موجودہ نظام تعلیم کو بدل کر از سر نو اس کی تشکیل کی جائے۔

اس سلسلہ میں دوسرے ترقی یافتہ ممالک خصوصاً روس کے نظام تعلیم پر غور کرنے کی زیادہ ضرورت ہے لیکن محض غور کرنے سے کیا کام چل سکتا ہے اگر تجرباتی حیثیت سے اس پر عمل نہ کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہاں کے ماہرین تعلیم سے مدد لی جائے اور ان کے بتائے ہوئے اصول اور طریق کار کو رائج کرنے کے لئے، یہ شعبہ چند سال کے لئے انھیں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔

میں نہیں سمجھتا کہ جب ملک کے بہت سے دوسرے منصوبوں کی تکمیل کے لئے غیر ملکی ماہرین کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں تو شعبۂ تعلیم کے لئے کیوں نہ اس کو روا رکھا جائے، جبکہ ملک و قوم کی ترقی کی بنیاد ہی مفید تعلیم پر قایم ہے۔

امتحانگاہِ انتخاب

آزادی کے بعد تیرہ چودہ سال کا زمانہ جس طرح گزرا، گزر گیا۔ اگر وہ اچھا نہیں تھا تو برا بھی نہیں تھا، یعنی اگر جمہوریت کی صحیح روح یہاں پیدا نہیں ہو سکی تو کم از کم اس کے پیدا کرنے کی کوشش تو کی گئی — لیکن کیا آیندہ بھی یہی صورت باقی رہے گی یا اس میں کوئی تبدیلی ہوگی۔ اس کا صحیح علم تو اسی وقت ہوگا جب ۶۲ء کے انتخاب کے نتائج ہمارے سامنے آئیں گے، لیکن موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اگر ہم کانگرس حکومت کے اختتام کی پیش گوئی نہیں کر سکتے، تو اس قدر ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ غالباً زیادہ مفلوج ہو جائے گی کیونکہ وہ اب تک ان عناصر کو دور نہیں کر سکی جو دوستی کے پردہ میں اس کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔

یقیناً کانگرس میں اب بھی بعض افراد ایسے موجود ہیں جو مہاتما گاندھی کی تعلیم سے منحرف نہیں ہوئے، لیکن اول تو ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے — دوسرے یہ کہ انھیں حکومت سے اب کوئی دلچسپی بھی باقی نہیں رہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آیندہ انتخاب میں کانگرس کو جس زبردست فریق سے ٹکر لینا ہے وہ جن سنگھی جماعت ہے اور پچھلے چند تجربات بتاتے ہیں کہ اگر کانگرس نے ذرا بھی ڈھیل سے کام لیا تو اس جماعت کے برسر اقتدار آجانے کا قوی امکان ہے، اور اگر بدقسمتی سے یہ صورت پیش آئی تو پھر حکومت نام رہ جائے گا صرف جماعتی اقتدار کا اور جمہوریت کا نام و نشان بھی یہاں باقی نہ رہے گا۔

بہرحال ۶۲ء کی امتحان گاہ انتخاب اس میں شک نہیں بڑی سخت منزل ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کانگرس اس منزل سے کامیاب گزرے گی یا ناکام، لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ دونوں صورتوں میں حکومت کو اپنی موجودہ راہ بدلنا پڑے گی اور اب یہ حالات و واقعات پر منحصر ہے، کہ وہ راہ جمہوریت کی ہوگی یا جور و استبداد کی۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیندہ انتخاب میں مسلمانوں کو کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ ہر چند یہ سوال زیادہ پیچیدہ نہیں، لیکن ہو سکتا ہے کہ بعض حالیہ فسادات کے سلسلہ میں ان کو کانگرس حکومت کی طرف سے بدظنی پیدا ہو گئی ہو اور وہ آیندہ انتخاب میں اس کا ساتھ نہ دیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے اس وقتی احساس کے زیر اثر کانگرس کا ساتھ نہ دینے کا فیصلہ کیا تو وہ بڑی سخت غلطی کریں گے، کیونکہ کانگرس سے ہٹ کر کسی اور جماعت (کمیونسٹ، پرجا سوشلسٹ یا آزاد پارٹی) کے حق میں رائے دینا گویا جن سنگھ کا ہاتھ مضبوط کرنا ہے اور مسلمانوں کے حق میں جن سنگھ جماعت، مہا سبھائی جماعت سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس قسم کی غلطی بعض ضمنی انتخابات میں مسلمان پہلے بھی کر چکے ہیں اور اس کا خمیازہ اب تک بھگت رہے ہیں۔ اس لئے انتہائی غلطی ہوگی اگر وہ آیندہ عام انتخابات میں کانگرس کا ساتھ چھوڑ کر کسی اور جماعت کی حمایت کریں۔

اسلام کا نظریۂ جمہوریت

(تاریخ کی روشنی میں)

(نیاز فتحپوری)

پچھلے مہینے ملاحظات میں، سرسری طور پر مینے ظاہر کیا تھا کہ جمہوریت کا صحیح تصور اور اس کا عملی تجربہ جو اسلام نے پیش کیا اسکی نظیر دُنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی - اس پر بعض حضرات نے کچھ اعتراضات کئے ہیں جن کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ اس مسئلہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے۔

اس میں شک نہیں جمہوریت کا تصور کوئی نیا تصور نہیں اور اسلام سے پہلے بھی بعض مفکرین اسے پیش کر چکے تھے، لیکن فرق یہ ہے کہ قبل از اسلام جمہوریت کا تصور محض قومی، جماعتی اقتدار کا تصور تھا جامعۂ بشری کی اصلاح و ترقی کا کوئی سوال اس کے سامنے نہ تھا، برخلاف اس کے چونکہ اسلام کا خطاب بلا امتیاز ملک وملت ساری دُنیا سے تھا، اور اس کی بنیاد اخلاق پر قایم تھی اس لئے اس کا تصور جمہوریت ایک عالمگیر اخلاقی جمہوریت کا تصور تھا جس میں نہ ملک وقوم کی کوئی تخصیص تھی اور نہ جماعتی جذبۂ اقتدار کی، دنیا کا ہر انسان اس کے سامنے تھا اور تمام بنی نوع انسان کو صرف رشتۂ انسانیت سے وابستہ کرنا اس کا مقصود تھا۔

ظہورِ اسلام کے وقت دُنیا کا اخلاقی انحطاط

اگر آپ نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ظہورِ اسلام کے وقت دُنیا اخلاقی حیثیت سے کیسے سخت انحطاطی دور سے گزر رہی تھی - یورپ کے شرق وجنوب میں ایک عظیم الشان عیسوی حکومت (رومہ) ضرور موجود تھی، لیکن اس کا کیا رنگ تھا۔ اسے خود ایک انگریز مورخ برونم میور کی زبان سے سُن لیجئے، لکھتا ہے :-

"ساتویں صدی میں عیسویت انتہائی ذلیل اخلاقی دور سے گزر رہی تھی، اختلاف عقاید کی بنا پر مختلف جماعتوں میں خونریزی کا بازار گرم تھا اور مذہب نام رہ گیا تھا صرف عیاشی، بادہ نوشی اور واہمہ پرستی کا"

چین و ہندوستان جو کسی وقت تہذیب و تمدن کا گہوارہ سمجھے جاتے تھے، ان کا یہ حال تھا کہ اپنے دیوتاؤں اور اکابر مذہب سے بھی افعال شنیعہ کا ارتکاب منسوب کرتے ہوئے انھیں شرم نہ آتی تھی اور یہی حال فارس کا تھا۔

خود سرزمین عرب کا یہ حال تھا کہ ذہن و خیال کی کوئی پستی ایسی نہ تھی جو وہاں نہ پائی جاتی ہو، مختلف قبایل کے مختلف بت تھے اور انھیں کو تکمیل مقاصد کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ معمولی معمولی باتوں پر سالہا سال تک ایک دوسرے کا خون بہانا، رات دن بے نوشی، قمار بازی اور افعال شنیعہ میں مبتلا رہنا، کھلم کھلا عورتوں کا عصمت فروشی کرنا، اور مردوں کا ان ناجایز تعلقات کا حال بڑے فخر کے ساتھ کرنا حصول اولاد کے لئے بیویوں کو غیر مردوں کے پاس بھیجدینا (جسے وہ اپنی اصطلاح میں استبضاء کہتے تھے)، سوتیلی ماؤں سے شادی کرلینا، لڑکیوں کو زندہ دفن کردینا، یہ اور اسی قسم کی بہت سے خصایل رویہ، اہل عرب کی زندگی کا معمول تھے اور ان کی ذہنی پستی اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ ان میں اور وحشی درندے میں کوئی فرق باقی نہ رہا تھا۔ وہاں نہ کوئی دنیاوی قانون تھا نہ اخلاقی یا مذہبی تمام قبایل کی حکومت و سیاست ایک دوسرے سے علٰحدہ تھی اور کوئی مرکزی قوت ایسی نہ تھی جو ان کے نزاعی مسایل کا فیصلہ کرسکے

قانون صرف تیغ و سنان کا قانون تھا اور اخلاق و انصاف کے اقدار کلیتاً مفقود — یہ تھا وہ ماحول جس میں رسول اللہ نے جنم لیا اور چند سال کی مدت میں عربوں کی کایا پلٹ دی۔

حال ہی کا ایک مغربی مورخ ڈنی سن لکھتا ہے کہ :-

"پانچویں چھٹی صدی ہجری میں دُنیا ثقافتی نقطۂ نظر سے پستی کی اس منزل تک پہونچ گئی تھی کہ اس کو دیکھ کر اس امر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ انسانی تہذیب پھر کبھی لوٹ کر آ سکتی ہے۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اسی تاریک زمانہ میں ایک ایسا شخص (محمد) پیدا ہوا، اور اس نے زمانہ کا ورق اُلٹ کر رکھ دیا۔"

کیا اشاعت اسلام تلوار سے ہوئی

یہ بیان بظاہر اصل موضوع سے ہٹا ہوا نظر آتا ہے، لیکن بطور تمہید اس کا اظہار ضروری ہے تاکہ آپ یہ معلوم کر سکیں کہ اسلام نے ناسازگار حالات میں انسانیت کی کتنی عظیم خدمات انجام دیں اور اس وقت کی وحشیانہ تراجیت کو کتنی بلند جمہوری نظام حکومت میں تبدیل کر دیا۔

ممکن ہے بعض حضرات میری اس رائے کو مبالغہ قرار دیں، کیونکہ عام طور پر اسلام کے متعلق یہی خیال قائم کر لیا گیا ہے کہ وہ صرف تلوار سے پھیلایا گیا ہے اور اپنی جماعت کے سوا سب کو کافر و مشرک قرار دے کر ان کو قتل کر دینے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن دونوں باتیں بالکل غلط ہیں کیونکہ قرآن میں جن کافر و مشرک جماعتوں کا ذکر پایا جاتا ہے ان سے مراد دراصل صرف عربستان کی غیر مسلم قومیں تھیں اور ان سے جنگ و قتال کی اجازت صرف اس صورت میں دی گئی تھی کہ پہلے وہ خود حملہ کریں یا مسلمانوں کو اذیت پہونچائیں۔ چنانچہ ہر امر تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ رسول اللہ اور عہدِ خلفائے راشدین کی تمام لڑائیاں صرف مدافعت کی غرض سے لڑی گئیں یا پھر اس لئے کہ ان سے اپنی حفاظت مقصود تھی۔

رسول اللہ کے زمانہ میں سب سے پہلی لڑائی وہ ہے جو جنگ بدر کے نام سے مشہور ہے، لیکن یہ اس وقت لڑی گئی جب خود قریش نے مدینہ پر حملہ کیا۔ اس کے بعد جنگ اُحد اور جنگ احزاب میں بھی یہی ہوا کہ قریش نے مدینہ پر چڑھائی کر دی تھی۔ فتح مکہ کا سبب بھی یہی ہوا کہ قریش "حدیبیہ" کا معاہدہ توڑ کر مدینہ پر یلغار کی طیاریاں کر رہے تھے۔ جنگ خیبر کا سبب یہ تھا کہ وہ یہودیوں کا مرکز تھا جہاں بیٹھ کر وہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے۔ حُنین میں بھی قبایل ہوازن نے یہودیوں کا سا طریقہ اختیار کر رکھا تھا اور جنگ تبوک کا سبب بھی صرف یہ تھا کہ رومی سلطنت شام کے علاقہ پر حملہ کر کے وہاں کے مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنانے کی تدابیر میں مصروف تھی۔ الغرض عہدِ نبوی میں کوئی لڑائی ایسی نہیں لڑی گئی جس کا مقصود جبراً اسلام پھیلانا ہو، کیونکہ قرآن نے اس قسم کے جبر و اکراہ کو ممنوع قرار دیدیا تھا اور رسول اللہ سے احکام قرآنی کی خلاف ورزی ممکن نہ تھی۔

رسول اللہ کے بعد خلفاء راشدین کے زمانہ میں بھی کوئی واقعہ ہمیں ایسا نہیں ملتا کہ مسلم افواج نے محض اشاعت اسلام یا توسیع حکومت کے لئے کسی قوم یا ملک پر حملہ کیا ہو۔ اس کے بعد جب عہد بنی امیہ میں مذہب اسلام نے حکومت اسلام کی صورت اختیار کر لی تو بیشک اس میں ہوس ملک گیری بھی شامل ہو گئی اور وہ نظام جمہوریت بھی ختم ہو گیا جو عہدِ نبوی و خلافت راشدہ میں پایا جاتا تھا۔

اسلام کا نظامِ حکومت

اب آیئے غور کریں کہ رسول اللہ نے جس نظامِ حکومت کی بنیاد ڈالی اور بعد کو خلفاء راشدین نے بھی جس کو قایم رکھا، کیسا نظام تھا اور اسے کس نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ سلطنت و حکومت کے متعلق قرآنی تعلیمات کیا ہیں۔

اسلام سے پہلے حکومت و سلطنت کا ایک ہی مفہوم لوگوں کے سامنے تھا اور وہ تھا شخصی حکومت، ذاتی اقتدار اور مطلق ملوکیت کا تصور جس کی رو سے صرف بادشاہ یا فرمانروا کو ملک اور اہلِ ملک کی جان و مال کا مالک و مختار سمجھا جاتا تھا اور دُنیا کے

تمام مذاہب میں سب سے پہلے اسلام نے اس شخصی اقتدار اور انفرادی حکومت کی مخالفت کی اور بتایا کہ دُنیا میں ملکیت کا حق کسی انسان کو حاصل نہیں بلکہ " مالک السماوات والارض و مابینہما " (آسمان و زمین کی ہر چیز کا مالک خدا ہے اور خدا ہی جس کو چاہتا ہے بادشاہت دیتا ہے اور اس سے چھین لیتا ہے (تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء) - گویا اسلام نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اصل حکومت و ملکیت خدا کی ہے اور بادشاہ اس ملکیت کا صرف امانت دار ہے اور خدا کے سامنے اس کا جواب دہ۔ جس کی صراحت رسول اللہ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ :-

" کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ - الامام راعٍ ومسئول عن رعیتہ "۔

(یعنی حاکم وفرمانروا اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار ہے اور اگر وہ تباہ ہے تو اس کا ذمہ دار حاکم ہی قرار دیا جائے گا)

اسی اصول کے پیش نظر قرآن نے نااہل حاکموں کی پہچان بھی بتادی ہے کہ :-

" اذا تولّٰی سعی فی الارض لیفسد فیہا ویہلک الحرث والنسل "۔ یعنی جب وہ حاکم ہو جاتے ہیں تو اطمینان و سکون کی جگہ رعایا میں فتنہ و فساد کا سبب بن جاتے ہیں اور اس طرح تمام عمرانی و اقتصادی نظام کو تباہ کر دیتے ہیں۔

اسی کے ساتھ حکومت کا صحیح معیار بھی ان الفاظ میں ظاہر کر دیا ہے کہ :-

" ان اللہ یامرکم ان تؤدّوا الامانات الیٰ اہلہا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل "

یعنی صحیح معنی وہی شخصی حکومت کا اہل ہے جو قوم کے تمام حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور وہ اپنے فیصلہ میں عدل و انصاف سے کبھی منحرف نہیں ہوتا۔

پھر اگر کوئی حاکم اپنے فرایض کو واقعی پوری دیانت و امانت کے ساتھ انجام دیتا ہے اور وہ قیام عدل کے لئے کوئی قانون وضع کرتا ہے تو رعایا کو بھی پوری طرح اس کی اطاعت کی ہدایت کی گئی ہے خواہ وہ حاکم حبشی ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر کوئی حاکم جابر و ظالم ہے (خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو) تو پھر رعایا کو اس پر نکتہ چینی کا بھی پورا حق حاصل ہے اور رسول اللہ نے اس کو " افضل الجہاد " ظاہر کیا ہے[1]۔

الغرض اسلام نے حکومت کی اولین شرط یہ قرار دی ہے کہ اس میں عدل و انصاف سے کام لیا جائے اور تمام رعایا کے جذباتی، ذہنی و اقتصادی حقوق کو پورا کیا جائے تاکہ ملک میں فتنہ و فساد نہ پیدا ہو اور ہر شخص اپنی جگہ اطمینان و سکون کی زندگی بسر کر سکے۔

لیکن اس خیال سے کہ تنہا ایک شخص غلطی بھی کر سکتا ہے اور اس کی رائے نامناسب بھی ہو سکتی ہے، قرآن پاک نے یہ ہدایت بھی کر دی ہے کہ بہترین فیصلہ وہی ہے جو باہم مشورہ کے بعد کیا جاتا ہے (ملاحظہ ہو آیت ۳۸ - سورۂ شوریٰ)۔ اور رسول اللہ کی ہدایت بھی یہی تھی کہ :- " ہر امر کا فیصلہ منتخب لوگوں کے مشورہ سے کرو اور صرف ایک شخص کی ذاتی رائے پر بھروسہ نہ کرو "۔

چنانچہ خود رسول اللہ تمام اہم معاملات میں ہمیشہ اپنے صحابہ سے مشورہ کر لیا کرتے تھے، یہاں تک کہ اگر مجلس شوریٰ کا فیصلہ آپ کی مرضی کے خلاف ہوتا تو بھی اسی پر کاربند ہوتے - چنانچہ قریش نے جب تیسری بار مدینہ پر حملہ کیا تو آپ نے اپنے صحابہ سے مشورہ کیا کہ مدافعت کی بہترین صورت کیا ہو سکتی ہے، آپ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر مدافعت کی جائے لیکن اکثر صحابہ نے آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا اور آپ نے اسے مان لیا، ہر چند یہ فیصلہ مناسب نہ تھا اور اس سے مسلمانوں کو کافی نقصان پہونچا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ انتظامی امور میں باہمی مشورہ کو کتنا ضروری خیال کرتے تھے اور یہ تھی سب سے پہلی بنیاد صحیح جمہوریت کی جو اسلام نے قایم کی۔

---

[1] عن ابی سعید قال رسول اللہ افضل الجہاد من قال کلمۃ حق عند سلطان جابر (ترمذی)

جمہوریت اسلام کے اصول

اسلام نے جس نظام حکومت کو جاری کیا اس کے بنیادی اصول چار تھے :۔ (۱) ملک کو خدا کی ملکیت و امانت سمجھنا اور ایک دیانتدار امین ہی کی طرح اس کی حفاظت کرنا۔ (۲) رعایا کو اظہار رائے کی پوری آزادی دینا۔ (۳) ملکی انتظامات اور وضع قوانین میں اہل ملک سے مشورہ کرنا۔ (۴) انسانی حیثیت سے حاکم و محکوم دونوں کا ایک ہی سطح پر لے آنا۔ (۵) عدل و انصاف میں دوست دشمن کا فرق و امتیاز اُٹھا دینا۔

رسول کا کردار

اب آیئے دیکھیں کہ رسول اللہ اور خلفاء راشدین نے ان اصول پر عمل کیا یا نہیں، تاریخ کے صفحات آپ کے سامنے کھلے ہوئے ہیں، میرے کہنے سے نہیں بلکہ خود اس کے مطالعہ کے بعد فیصلہ کیجئے کہ رسول اللہ کی بلندی اخلاق کا کیا عالم تھا اور مساوات کی کیسی زبردست مثال آپ نے قایم کی۔

سادگی اخلاق و معاشرت

آپ کی زندگی کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے تمام کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ بکریوں کا دودھ دوہنا، کپڑوں میں پیوند لگانا، جوتے کی مرمت کرنا، گھر کے کاموں میں بیویوں کا ہاتھ بٹانا، جھاڑو دینا، اونٹوں کو خود اپنے ہاتھ سے کھولنا باندھنا، یہ سب کچھ وہ خود اپنے دستِ مبارک سے کرتے تھے۔

مدینہ میں جب مسجد نبوی کی تعمیر شروع ہوئی تو آپ نے دوسرے مزدوروں کے ساتھ خود بھی زمین کھودنے اور مٹی گارا لیجانے میں برابر کا حصہ لیا۔ اور جب مدینہ کی حفاظت کے لئے خندق کھودی جانے لگی تو آپ خود پھاوڑا لے کر کھدائی میں مصروف ہو گئے۔

وہ اس کو ناپسند کرتے تھے کہ جب آپ کسی مجلس میں پہونچیں تو لوگ اُٹھ کر تعظیم دیں۔ ایک بار صحابہ نے ایسا کرنا چاہا تو آپ نے منع کر دیا کہ یہ رسم عجمیوں کی ہے۔ آپ نے کبھی پسند نہیں کیا کہ کوئی شخص آپ کی دست بوسی کرے۔ آپ معمولی غلام کی دعوت بھی قبول کر لیتے تھے اور عوام سے اتنے ملے جلے رہتے تھے کہ کوئی اجنبی شخص کسی مجلس میں پہچان ہی نہ سکتا تھا کہ آپ کون اور کہاں ہیں۔

سادگی معاشرت کا یہ رنگ تھا کہ جو کچھ میسر آیا وہ کھا لیا، جو کپڑا مل گیا پہن لیا۔ آپ کو یہ معلوم ہے کہ اس وقت بھی جب خیبر فتح ہوا ہے اور مالِ غنیمت سے آپ ہزاروں روپیہ مستحقین کو تقسیم کر دیا کرتے تھے، آپ کا قصر اور فرنیچر کیا اور کیسا تھا۔ صرف دو حجرے، ایک بوریا اور پانی کا گھڑا۔

دوستوں کے ساتھ آپ کا سلوک تو خیر اچھا ہونا ہی چاہئے تھا، لیکن آپ نے دشمنوں کے حق میں بھی عفو و درگزر سے کام لیا۔ عبداللہ بن ابی بڑا متعصب یہودی تھا جس نے ہمیشہ رسول اللہ کو ذہنی تکلیف پہونچائی، لیکن آپ کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے لئے دعائے خیر مانگی اور خود اپنی قمیص سے اس کا کفن طیار کرایا۔

عفو و کرم

جب مکہ فتح ہوا تو تمام سرداران قریش جو کامل تیرہ سال تک آپ کو ہر ممکن اذیت پہونچاتے رہے تھے اور جن کے ہاتھوں سے آپ کے سیکڑوں اعزہ و احباب قتل ہو چکے تھے، آپ کے قیدی تھے اور آپ جس طرح چاہتے ان سے انتقام لے سکتے تھے، لیکن آپ نے سب کو آزاد کر دیا اور باز پُرس کرنے کے بجائے، ان کے حق میں دعائے خیر سے کام لیا۔

کیا دنیا کی تاریخ میں ایسے غیر معمولی ایثار اور جذبۂ رحم و کرم کی کوئی دوسری مثال پیش کی جا سکتی ہے اور کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام کی اشاعت تلوار سے نہیں بلکہ صرف بلندی اخلاق کے مظاہرہ سے ہوئی ہے۔

عدل و انصاف

ایک حاکم عدل و انصاف سے صحیح معنی میں اسی وقت کام لے سکتا ہے جب وہ انسان کو انسان کی نگاہ سے دیکھے اور تفریق قوم و ملت یا اختلاف نسل و مذہب کا کوئی سوال اس کے سامنے نہ ہو اور اسی کا دوسرا نام مساوات عامہ ہے۔ پھر دیکھئے کہ رسول اللہ کا طرز عمل اس باب میں کیا تھا۔ یوں تو منصب نبوت عطا ہونے سے پہلے ہی آپ اپنی دیانت و امانت، حق پسندی و صداقت پرستی کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے تھے، حتیٰ کہ مدینہ کے یہود اور کفار بھی اپنے جھگڑوں میں آپ ہی کو اپنا حکم بناتے تھے اور آپ ہی کے فیصلہ پر عمل کرتے تھے، لیکن ادعائے نبوت کے بعد اس جذبہ نے

دینی صورت اختیار کرلی اور آپ نے جس سختی کے ساتھ عدل وانصاف کو قایم کیا اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایک بار جب ایک یہودی اور مسلمان کی نزاع کا مسئلہ آپ کے سامنے آیا تو آپ نے یہود کے حق میں فیصلہ کیا، آپ سمجھتے تھے کہ اس سے ایک پورا قبیلہ آپ کے خلاف ہوجائے گا، لیکن آپ نے اس کی مطلق پروا نہیں کی۔

آپ بستر مرگ پر زندگی کی آخری سانسیں لے رہے ہیں اور یہ وہ وقت ہے جب سب سے پہلے آپ کو آیندہ نظام حکومت کے متعلق کچھ ہدایات دینا چاہئے تھی لیکن آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ آپ کا آخری ارشاد صرف یہ تھا کہ:-

"اگر کسی کا کوئی مطالبہ میرے ذمہ ہو تو وہ مجھ سے طلب کرلے اور اگر کسی کو مجھ سے اذیت پہونچی ہے تو اس کا بدلہ مجھ سے لیلے"

یہ تھا وہ بے مثل جذبۂ عدل و مساوات جس پر اسلام کی بنیاد قایم ہوئی اور پھر بھی لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا، بلندی اخلاق سے نہیں۔

افسوس ہے کہ آپ کی عمر نے زیادہ وفا نہیں کی اور زمانہ نے صرف چند سال کی مہلت آپ کو دی، لیکن اس قلیل مدت میں اس غیر معمولی شخصیت کے جو اثرات اپنے بعد چھوڑ گئے وہ آپ کے بعد خلفاء راشدین کے عہد تک بدستور قایم رہے اور ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جس جمہوریت کی بنیاد قایم کی تھی اس کے نقوش کتنے واضح، کتنے بلند اور کس درجہ ترقی یافتہ تھے۔

ابوبکر صدیق کا اصول حکومت

جب رسول اللہ کی رحلت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت خلافت کرلی تو آپ نے سب سے پہلے جو خطبہ یا پیام عوام کو سنایا اس کے الفاظ یہ تھے کہ:-

"اے لوگو اگر میں سیدھی راہ چلوں تو میرے ساتھ تعاون کرو اور اگر میں غلط راہ اختیار کروں تو مجھے ٹوک دو"

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ:-

"میری اطاعت صرف اس وقت کرو جب تک میں خدا و رسول کی ہدایت پر عمل کروں اور اگر میں ایسا نہ کروں تو ہرگز میری اطاعت نہ کرو اور مجھے معزول کردو"

عدل وحق شناسی کے سلسلہ میں بھی آپ نے صاف صاف کہدیا کہ:-

"تم میں ہر وہ شخص جو کمزور ہے میری نگاہ میں قوی ہے جب تک میں اس سے چھینے ہوئے حقوق نہ دلوادوں اور ہر وہ شخص جو قوی ہے میری نگاہ میں کمزور ہے، جب تک میں اس کے غصب کئے ہوئے حقوق اس سے چھین نہ لوں"

یہ تھا وہ زبردست بنیادی تصور عدل وانصاف اور مساوات عامہ کا جو اسلام نے پیش کیا۔ جمہوریت کی دوسری بنیاد "مشورہ وکثرت رائے" ہے، سو اس باب میں بھی حضرت ابوبکر کا عمل یہ تھا کہ وہ تمام اہم مسایل میں سب سے پہلے صحابہ کو جمع کرلیتے اور ان کے مشورہ کے بعد کثرت رائے پر عمل کرتے۔

ان کی حیثیت یقیناً ایک حاکم وفرمانروا کی سی تھی، لیکن ایک خود مختار فرمانروا کی سی نہیں، بلکہ ایک ایسے سربراہ کی سی، جو پنچایت کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھاتا تھا۔

آپ کے عدل وانصاف اور خود پسندی کے ثبوت میں یوں تو بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن سب سے زیادہ روشن وہ اُصول ہیں جو انھوں نے جنگ وصلح کے باب میں وضع کئے تھے، وہ اصول یہ تھے کہ:-

۱ــــ لڑائی میں کسی بچّہ، عورت اور ضعیف انسان پر ہاتھ نہ اُٹھایا جائے۔

۲ــــ کسی مذہب کے راہب یا پجاری یا معبد کو صدمہ یا نقصان نہ پہونچایا جائے۔

۳ــــ نہ کوئی بارآور درخت کاٹا جائے، اور نہ کسی مکان کو مسمار کیا جائے۔

۴ــــ شرائط صلح پر سختی سے عمل کیا جائے اور کسی صورت میں اس کے خلاف قدم نہ اُٹھایا جائے۔

۵ ـــــ جو قومیں مسلمانوں کی پناہ میں آگئی ہیں ان کو تمام وہی حقوق حاصل ہوں گے جو عام مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

کیا اس سے بہتر کوئی اور تصور جمہوری حکومت کا پیش کیا جا سکتا ہے۔

حضرت عمر کی جمہوریت پسندی

جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں سب سے پہلے قرآن ہی نے نظم و نسق کے باب میں مشورہ سے کام کرنے کا اصول قایم کیا، یہاں تک کہ جس سورت میں اس کا ذکر کیا گیا ہے اس کا نام ہی سورۂ شوریٰ رکھ دیا گیا ہے۔ اس پر رسول اللہ اور حضرت ابوبکر دونوں نے پوری طرح عمل کیا اور اس کے بعد جب حضرت عمر خلیفہ ہوئے اور دائرۂ اسلام وسیع ہوا تو نظام شوریٰ نے اور زیادہ وسعت اختیار کر لی۔

حضرت عمر نے مجلس شوریٰ کے دو ایوان قایم کئے ایک بالکل اسی قسم کا جسے آج کل جنرل اسمبلی کہتے ہیں۔ اس میں تعداد شرکاء کی زیادہ تھی اور ملک کے تمام اہم مسایل اسی میں پیش کئے جاتے تھے۔ دوسرے ایوان میں جو نسبتاً کم ممبروں پر مشتمل تھا، روز کے معاملات پر بحث ہوتی تھی اور سلطنت کے عمال و حکام کے نصب و عزل کا فیصلہ بھی اسی مجلس عاملہ میں کیا جاتا تھا۔ جنرل اسمبلی کی شرکت کے لئے نہ صرف تمام صوبوں کے مسلم عمال اور ان کے نائب مدعو کئے جاتے تھے، بلکہ غیر مسلم افراد کو بھی شرکت کا موقع دیا جاتا تھا، چنانچہ انتظام عراق کے سلسلہ میں وہاں کے ایران نژاد امراء سے بھی مشورہ کیا گیا اور مصر کے انتظام میں مقوقس کی رائے بھی حاصل کی گئی، اسی طرح ایک قبطی نمایندہ بھی مدینہ میں طلب کر کے اس کی رائے دریافت کی گئی۔

طلب رائے کا یہ اصول حضرت عمر کے زمانہ میں اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ نہ صرف خواص بلکہ عوام کی رائے کو بھی خاص اہمیت دی جاتی تھی اور صوبوں کے گورنروں کا تقرر ہمیشہ عوام کی رائے کے مطابق ہوتا تھا۔

اگر کسی گورنر کے خلاف کوئی شکایت پہونچتی تھی تو فوراً ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جاتا اور اگر شکایت صحیح ثابت ہوتی تو فوراً اسے معزول کر دیا جاتا خواہ اس کی شخصیت کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو۔ چنانچہ حضرت سعد (فاتح فارس) گورنر کوفہ کے خلاف وہاں کے لوگوں نے شکایت کی تو انھیں فوراً معزول کر دیا گیا، گو شکایت زیادہ اہم نہ تھی۔

اصول یہ تھا کہ گورنر خادم قوم ہے، مخدوم نہیں اس لئے اگر وہ کسی وقت افراد قوم کا اعتماد کھو بیٹھے تو اس کو علٰحدہ ہو جانا چاہیئے حضرت عمر صوبہ کے باشندوں سے پوچھتے تھے کہ عہدۂ گورنری کے لئے وہ کس کو نامزد کرتے ہیں اور ہر شخص کو پورا حق حاصل تھا کہ وہ پوری آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرے۔

حضرت عمر اپنے خطبات میں ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہر شخص آزاد پیدا ہوا ہے اور اسے آزاد رائے دینے کا فطری حق حاصل ہے۔ ایک بار کسی شخص نے شکایتاً آپ سے کہا کہ "اے عمر خدا سے ڈرو" لوگوں نے اسے کچھ اور کہنے سے روکنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ اسے کہنے دو جو کہنا چاہتا ہے، وہ آزاد ہے اور اسے حق حاصل ہے کہ جو جی میں آئے آزادی سے کہے۔"

اس وقت کوفہ، شام اور بصرہ بڑے اہم صوبہ سمجھے جاتے تھے اور وہاں کے گورنروں کا تقرر بہت کچھ وہاں کے باشندوں کی رائے پر منحصر تھا۔ اس باب میں حضرت عمر خود اپنے آپ کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ سمجھتے تھے اور اگر کسی شخص کو آپ کے خلاف شکایت ہوتی تھی تو وہ برملا اس کا اظہار کر سکتا تھا اور آپ اپنے آپ کو اس کا جوابدہ سمجھتے تھے۔

ایک بار جب اُبی بن کعب نے آپ کے خلاف جناب زید بن ثابت کی عدالت گاہ میں دعویٰ کیا جب آپ جوابدہی کے لئے وہاں پہونچے تو زید بن ثابت نے آپ کو تعظیم دینا چاہی تو آپ کو بہت ناگوار ہوا اور کہا کہ عدالت گاہ میں میری حیثیت صرف خطاب کے بیٹے کی ہے، خلیفۂ رسول کی نہیں۔ یہاں سب برابر ہیں اور تعظیم و تکریم ناجایز ہے۔

حضرت عمر کی سادگی و حاکمانہ بیداری

باوجود اس شوکت و جبروت اور عظمت و بلندی کے آپ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے تمام کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، اگر کوئی اونٹ بیمار ہو جاتا

یا کھو جاتا تو خود اپنے ہاتھ سے دوا لگاتے اور خود اس کے ڈھونڈھنے کو نکل جاتے۔

جس زمانہ میں ایرانیوں سے جنگ چھڑی ہوئی تھی اور سانڈنی سواروں کے ذریعہ سے خبریں روز کے روز آتی رہتی تھیں، تو آپ مدینہ سے میلوں دور تنہا جا جا کر دیکھا کرتے تھے کہ سانڈنی سوار آرہا ہے یا نہیں۔ ایک بار ایسا ہوا کہ آپ جنگ کا حال پوچھتے ہوئے دوڑتے دوڑتے اس کے ساتھ ساتھ مدینہ تک پہونچ گئے۔

جب ہرمزان ایرانی سردار قیدی کی حیثیت سے آپ کے سامنے لایا گیا تو آپ مسجد کے فرش پر لیٹے ہوئے تھے اور آپ کے جسم کے نیچے چٹائی بھی نہ تھی۔

جب آپ معاہدۂ بیت المقدس پر دستخط کرنے کے لئے وہاں پہونچے تو موٹے کپڑے کا کرتا آپ کے جسم پر تھا اور وہ بھی پیوند لگا ہوا آپ سے لوگوں نے کہا بھی کہ اچھا لباس پہن کر جائیے لیکن آپ نے فرمایا کہ ایک مسلم کی عزت لباس نہیں بلکہ اس کا تقویٰ ہے۔

ایک بار جب عرب میں قحط پڑا تو آپ کی بے چینی و اضطراب کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی پیٹھ پر غلّہ کے بورے لاد لاد کر لوگوں کو پہونچاتے تھے اور کھانا طیار کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

آپ رات رات بھر گشت لگا کر فاقہ زدہ گھرانوں کا پتہ چلاتے۔ ایک رات اتفاقاً آپ ایک ایسے گھر پر پہونچے جہاں بچے بھوک کی وجہ سے بیتاب تھے اور ان کی ماں نے محض بچوں کی تسکین کے لئے خالی ہانڈی چولھے پر چڑھا رکھی تھی۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ کانپ گئے اور اسی وقت مدینہ پہونچ کر جو تین میل دور تھا اپنی پیٹھ پر آٹے کا بورا لاکر وہاں پہونچایا۔ بعض لوگوں نے کہا بھی کہ لائیے بورا ہمیں دیجئے ہم پہونچا دیں گے، لیکن آپ نے فرمایا کہ:۔ "اس دنیا میں تو میرا بوجھ تم بٹا سکتے ہو، لیکن آخرت میں تو مجھے اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا پڑے گا۔"

عوام کی مشکلات سننے کے لئے آپ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا اور گورنروں کو بھی آپ نے حاجب و دربان رکھنے کی ممانعت کر دی تھی تاکہ عوام ہر وقت آسانی سے ان تک پہونچ سکیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ آپ کا سلوک

حضرت عمرؓ بہ حیثیت انسان ہونے کے سب کو ایک سمجھتے تھے .... اور ادائے حقوق کے باب میں مسلم و غیر مسلم تفریق کے سخت مخالف تھے۔ حتیٰ کہ اپنے بستر مرگ پر منجملہ دیگر ہدایات کے ایک ہدایت آپ نے یہ بھی کی تھی کہ غیر مسلموں کے حقوق کا خاص خیال رکھا جائے اور ان پر کبھی کوئی ایسا بوجھ نہ ڈالا جائے جو ان کے لئے ناقابل برداشت ہو۔

ایک بار دوران سفر میں آپ نے دیکھا کہ بعض غیر مسلموں سے جزیہ سختی سے طلب کیا جا رہا تھا، آپ ٹھہر گئے اور یہ دیکھ کر کہ واقعی نادار ہیں، جزیہ معاف کر دیا۔

ان کے زمانہ میں غیر مسلموں کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی اور اگر کبھی ان کی طرف آثار بغاوت ظاہر ہوتے تھے، تو بھی بہت نرمی سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ جب خیبر کے یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں کی طرف سے سازشیں زیادہ ہونے لگیں تو آپ نے صرف یہ حکم دیا کہ وہ خیبر و نجران چھوڑ دیں اور ان کے تمام املاک کی قیمت جو وہ چھوڑ گئے تھے بیت المال سے ادا کر دی، اسی کے ساتھ دوسری جگہ منتقل ہوتے وقت ان کے لئے سفر کی آسانیاں بھی پیدا کی گئیں اور یہ بھی حکم دیا کہ جب تک یہ لوگ دوسری جگہ اطمینان سے جم نہ جائیں، ان سے جزیہ نہ وصول کیا جائے۔

صدقہ و زکوٰۃ سے جو رقم وصول ہوتی تھی وہ صرف مسلمانوں ہی کی امداد پر صرف نہ ہوتی تھی بلکہ غیر مسلموں کو بھی اس میں برابر کا شریک سمجھا جاتا تھا۔

ایک بار آپ نے کسی عیسائی بھیک مانگتے دیکھا تو آپ نے اس کے گزارہ کے لئے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا۔ آپ نے جب ضعیف و

ناکارہ لوگوں کی پنشن جاری کرنے کا قاعدہ مقرر کیا تو اس میں مسلم و غیر مسلم دونوں کے حقوق برابر برابر رکھے۔ آپ نے جو محتاج خانے قایم کئے تھے وہ مسلم و غیر مسلم دونوں کی جائے پناہ تھے۔

جزیہ کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام پر بڑا ظالمانہ ٹیکس تھا، حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ اول تو جزیہ کی رقم نہایت حقیر ہوتی تھی جس کی ادائی کسی پر بار نہ ہو سکتی تھی، دوسرے یہ کہ غیر مسلم اس کی بنا پر کتنی آفات سے محفوظ رہتے تھے۔ حکومت ان کے معاش اور جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار تھی اور وہ فوجی خدمت کی شرکت سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔ اگر کوئی غیر مسلم اپنی خوشی سے جنگ میں حصہ لیتا تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جاتا تھا۔

عہدِ عثمان عہدِ عثمانی کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے عہد میں مملکت اسلام کے حدود بہت وسیع ہو گئے لیکن اس کے باوجود حکومت کا اصول وہی قایم رہا جو عہد خلیفۂ دوم میں پایا جاتا تھا۔ مجلس شوریٰ کا جو آئین پہلے قایم ہو چکا تھا وہی بدستور قایم رہا اور تمام امور اسی کونسل میں طے پاتے تھے۔ تمام صوبوں کے نظم و نسق کی اطلاعات بروقت پہونچتی تھیں اور نماز جمعہ کے بعد تمام صحابہ و حاضرین کو ان سے آگاہ کر کے مناسب احکام جاری کئے جاتے۔

عہدِ علی حضرت علی کا دور خلافت بڑے تشتت و انتشار کا دور تھا اور قتل عثمان کے بعد بعض ایسی سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں کہ آپ کا بیشتر زمانہ انھیں گتھیوں کے سلجھانے میں صرف ہو گیا، یہاں تک کہ آخر کار مذہب اسلام نے حکومت اسلام کی صورت اختیار کر لی اور شوریٰ و انتخاب کا وہ دور ختم ہو گیا جس کی بنیاد عہد رسالت میں پڑی تھی اور جو خلیفۂ ثانی کے زمانہ میں اپنے انتہائی عروج کو پہونچ گیا تھا۔

مادرِ وطن کے فلاح و بہبود کے لئے

ہمارے اقدامات

نہایت نفیس، پایدار اور ہم وار

اونی ویونگ یارن

اور

ہینڈ نٹنگ وول

ہمارے یہاں جدید ترین طریقے سے طیار کئے جاتے ہیں۔

گوکل چند رتن چند وولن ملز (پرائویٹ) لمیٹیڈ (انکارپوریٹیڈ ان بمبی)

کوئنز روڈ امرت سر

جدید ایرانی شاعری کا سیاسی پس منظر

(آفتاب اختر)

ایران انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں بڑے اہم تغیرات اور سیاسی بحرانوں کا مرکز رہا ہے، اس زمانہ میں قاچاریوں کے استبدادی نظام نے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا، اور لوگوں کے جگر حکمرانوں کے ظلم برداشت کرتے کرتے چھلنی ہو چکے تھے۔ جس کا ذکر مشہور ایرانی شاعر سید اشرف رشتی[1] نے اپنے مرثیہ میں اس طرح کیا ہے :-

گر دید وطن عزقہ اندوہ و محن وائی ——— اے وائی وطن وائی
خونیں شدہ صحراو تل و دشت و دمن وائی ——— اے وائی وطن وائی
پژمردہ شد ایں باغ و گل و سرو و سمن وائی ——— اے وائی وطن وائی

اشرف رشتی نے اس مرثیہ کا اختتام نہایت درد و کرب کے ساتھ اس طرح کیا ہے :-

اشرف بجز از لالۂ غم ہیچ نہ بوید ——— ہر لحظہ بگوید
اے وائی وطن وائی وطن وائی وائی وطن وائی ——— اے وائی وطن وائی

اشرف رشتی نے جس دور کے ایران پر روشنی ڈالی ہے اس وقت عام لوگوں کی زبانوں پر قفل لگے ہوئے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہیں اُن کو بھی اس ناقابل عفو جرم کی پاداش میں سولی پر چڑھنا نہ پڑے، لیکن دل سے وہ اس حکومت اور ان لوگوں کے خاتمے کی دُعائیں کر رہے تھے۔

ایران میں تحریک آزادی کا آغاز دوسرے ممالک مقابلہ میں ذرا تاخیر سے ہوا کیونکہ ایرانی ہمیشہ سے اس کا عادی رہا ہے کہ جب سب کچھ ہو چکے تو چونکے۔ ایرانی شاعرہ پروین[2] اعتصامی نے بڑی خوبصورتی سے "کار ہائے ما ہیں" اس کی طرف اشارہ کیا ہے :-

بہ کار خویش نہ پرداختیم نوبت کار ——— تمام عمر نشستیم و گفتگو کردیم
بہ وقت ہمت و سعی و عمل ہوس راندیم ——— بہ روز کوشش و تدبیر آرزو کردیم
عبث بہ چہ نہ فتادیم دیو آز و ہوا ——— ہر آنچہ کرد بدیدیم و ہمچو او کردیم

---

[1] سید اشرف الدین الحسینی ۱۸۷۱ء میں رشت میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں جب مشروطہ کا قیام عمل میں آیا اس وقت سے روزنامہ "نسیم شمال" کے مدیر ہو گئے۔ انھوں نے اپنی تحریر و تقریر سے ایرانیوں کی مردہ رگوں میں نیا خون دوڑا دیا۔ آخر عمر میں دماغی توازن میں خرابی آنے کی وجہ سے طہران میں زندگی کے آخری ایام گوشہ نشینی میں بسر کرنا پڑے۔ انھوں نے "خطاب بہ فرنگیاں"، "بکیس وطن"، "ترانۂ جوانان"، "در نومیدی بسے امیداست"، "بکران کابینہ" اور "بایران نگر" جیسی قابل قدر نظموں کی تخلیق کی تھی۔

[2] پروین اعتصامی کی ولادت ۱۹۰۷ء میں طہران میں ہوئی۔ انگریزی، عربی، فارسی میں قدرت کاملہ حاصل ہے۔ شاعری کا زیادہ تر مواد اخلاقی اور ناصحانہ ہے۔ انداز بیان میں دلکشی ہے۔ مشہور نظموں میں "کار ہائے ما" اور "اندرز ہائے من" کا شمار ہوتا ہے۔

چناں زسفرہ ببردند سفرہ گسستردیم، چو آب خشک شد اندیشہ سو کردیم

جب ایشیا آزار ہونے لگا تو ان کی بھی آنکھیں کھلیں۔ جب گرد و نواح کی دنیا جاگ اٹھی تو انھوں نے محسوس کیا کہ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ سوچ کر انھوں نے بھی بیداری کے لئے انگڑائی لینا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں آقائے پور داؤد[1] کی ایک نظم "ایرانیاں ایرانیاں" کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

مہر وطن افسانہ شد گلزار وطن ویرانہ شد شد خوار خاک پاتاں ایرانیاں ایرانیاں

پور داؤد نے اپنی نظم "رستخیز"[2] سے بھی ایرانیوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا کام لیا ہے۔ ذیل میں کچھ شعر ملاحظہ ہوں:-

برخیز زخواب وقت تنگ است
بشتاب کہ روز رزم جنگ است

ہل شیشۂ مے بگیر شمشیر از گیسوئے یار بند مپذیر،
بشتاب کہ ترسمت رسی دیر ایمست نہ موسم درنگ است

برخیز زخواب وقت تنگ است

خوش آں باشد کہ تیغ بازیم، اندر پیکار سر فرازیم،
شمشیر زخون سرخ سازیم، چندے است کہ تیغ زیر زنگ است،

برخیز زخواب وقت تنگ است

اس وقت ایران سیاسی کشمکش میں مبتلا تھا، مغرب و مشرق کی سامراجی طاقتیں وہاں اپنا اقتدار قایم کر رہی تھیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انھیں ایرآن سے کوئی ہمدردی تھی۔ بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح وہاں اپنے قدم جما کر تیل کے چشموں پر قابض ہو جائیں۔ اسی حرص و طمع سے ان بیرونی طاقتوں نے ایرانی حکمرانوں کو ہر طرح سے اپنے جال میں پھانسنے کی ترکیبیں کیں۔ ان کو ڈرایا بھی دھمکایا بھی۔ انھیں اپنے عیش کوش شہروں کی سیر کرا کے اپنا ہمدرد بنانے کی بھی کوششیں کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے حال میں گرفتار ہو کر اپنے اور بیگانے کا فرق بھول گئے۔ مشہور شاعرہ پروین اعتصامی نے "اندرزہائے من" میں ایرانیوں کو دوست اور دشمن پہچاننے کی تلقین کی ہے:-

بشناس فرق دوست زدشمن بہ چشم عقل مفتوں مشو کہ در پس ہر چہرہ چہرہ ہاست
زنگار ہاست در دل آلودگان دہر، ہر پاک جامہ را نتواں گفت پارساست

ناصرالدین شاہ قاچار نے ممالک غیر سے بڑی بڑی رقمیں قرض لے کر اپنے ذاتی عیش و آرام پر خرچ کرنا اپنا اصول بنا لیا تھا۔ وہ تین بار یورپ کی سیاحت کے لئے گئے، لیکن صرف اس لئے کہ وہاں کی مہ جبینوں کے حسن سے آنکھیں روشن کریں اور بستانِ فرنگ کے جلووں سے اپنے دل کو بہلائیں۔

ایرانی عوام خاموش ضرور تھے لیکن ان حالات سے بے خبر نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ: تجارت کی طرف حکومت کی کوئی توجہ ہے

---

[1] مرزا ابراہیم خاں پور داؤد ۱۸۸۵ء میں رشت میں پیدا ہوئے تھے، تاجروں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جنگ عظیم کے دوران کئی سال جرمنی میں قیام کیا۔ ۱۹۲۴ء میں ایران واپس ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں ہندوستان آئے اور تقریباً تین سال تک بمبئی میں رہ کر برلن روانہ ہو گئے جرمنی میں قیام کی وجہ سے جرمنوں سے محبت کرتے تھے۔ لیکن ایران اور ایرانیوں سے بھی بے حد محبت تھی۔

[2] یہ نظم ۱۹۱۵ء میں جنگ عظیم سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔

اور نہ صنعت وحرفت کا خیال عوام کی تعلیم سے کوئی واسطہ ہے نہ صحت وصفائی سے کوئی تعلق۔ بادشاہ کے عیش وآرام اور اس کی عیش کوشی نے وہاں امراء کو بھی بڑی حد تک اپنے ہی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ صرف شاہ ہی مست نہیں تھا بلکہ میر شجنہ اور شیخ سب ہی اس حمام میں ننگے تھے۔ اس سے متاثر ہوکر ملک الشعراء بہار[1] نے "کار ایراں" میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے :-

شاہ مست ومیر مست وشحنہ مست وشیخ مست ——— مملکت رفتہ زدست

ہر دم از دستاں مستاں فتنۂ وغوغا بپاست ——— کار ایراں باخداست

ایران میں جب غیر ملکی حکومتوں کو ضرورت سے زیادہ مراعات دی گئیں تو ایرانیوں کی غیرت قومی کو سخت ٹھیس لگی اور تبریز وصفاہان وگیلان ورشت وغیرہ جدوجہد آزادی کے مرکز بن گئے۔ ظلم وستم کو سرنگوں کرنے کے لئے عوام نے اپنی جان تک کی بازی لگادی۔ اشرف رشتی نے اُن کی جانبازی کو سرفروشی کو سراہتے ہوئے کہا ہے :

تاجہاں باقی است آزادیِ ایراں زندہ باد ——— غیرتِ مردانِ تبریز وصفاہاں زندہ باد

ہمت والائی سربازان گیلاں زندہ باد ——— رشت شد از شعر اشرف شکرستاں آفریں

آفریں برہمت اہل صفاہاں آفریں

شعراء عام طور سے بڑے حساس ہوتے ہیں۔ ایرانی شعراء سے بھی ضبط نہ ہوسکا انھوں نے اپنی شاعری میں چنگ ورباب کے بجائے تیر وسنان کو جگہ دی۔ اپنے نغموں میں گل کی مہک اور بلبل کی چہک کی جگہ توپ اور بندوق کی گھن گرج بھردی۔ ملک کے گوشہ گوشے انقلاب کے نعرے بلند ہونے لگے۔

ایرانی شاعروں نے اپنی شعلہ نوائیوں سے اپنے ہموطنوں میں جذبۂ انتقام پیدا کیا یہانتک کہ آخرکار ۱۸۹۶ء میں ناصرالدین قاچار کو گولی کا نشانہ بننا پڑا۔ اس کے بعد مظفرالدین شاہ قاچار تخت نشین ہوئے، تو بھی حالات وہی رہے، انھوں نے بھی یورپ کی سیر وسیاحت کا سلسلہ اسی طرح جاری رکھنا چاہا، ذاتی عیش وآرام کی خاطر دوسرے ممالک سے قرض بھی اسی فراخدلی سے لینے کی کوشش کی اور ایران کے حالات پہلے سے زیادہ بدتر ہوگئے۔ اس وقت ایران کے بہت سے محکمہ جات کسٹم وغیرہ روسیوں کے قبضہ میں آجانے سے پورا ملک ایک طرح سے مفلوج ہوکر رہ گیا۔

اشرف رشتی نے اسی پس منظر میں یہ اشعار کہے ہیں :-

بلبل نہ برد نام گل از واہمہ ہرگز ——— نرگس شدہ قرمز

بر منظرۂ قصر زراندود و مطلا ——— چغداست صف آرا

بنشستہ دراین بوم ودمن زاغ وزغن وای ——— اے وائی وطن وائی

اشرف رشتی دوسری جگہ ایران کی عظمت پارینہ کا خیال دلاتے ہوئے کہتے ہیں :-

آخر ایں ایراں کہ بود جائے جم پاتختِ کئی ——— اہل دئی ——— غرق غفلت تا بہ کئی

اسی شاعر نے اپنی نظم "بحران کابینہ" میں اس وقت کے ماحول پر روشنی ڈالی ہے۔ جب اجنبی ایران کی طرف پیشقدمی کررہے تھے :-

---

[1] ملک الشعراء بہار کا پورا نام محمد تقی خاں ہے۔ ۱۸۸۶ء میں مشہد میں ولادت ہوئی اور ۱۹۵۱ء میں طہران میں رحلت فرمائی۔ بہار نے گزشتہ نصف صدی میں اپنی تحریر وتقریر سے ادب اور سیاست کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا تھا۔ انھوں نے وطن پرستی کا نغمہ کچھ اس انداز میں چھیڑا کہ پورا ایران وجد کرنے لگا۔ دوبار وطن سے نکالے گئے مگر بہار بڑی خندہ پیشانی سے ان صعوبتوں کا مقابلہ کرتے رہے اور یہ صعوبتیں ان کے پائے استقلال کو متزلزل کرنے میں بری طرح ناکام رہیں۔ اپنے علمی کارناموں کے علاوہ مجلس ملی میں نمائندگی کرنے کا بھی موقع ملا۔ مشہور نظموں میں "وطن من"۔ "کار ایراں" وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

جائے بلبل مسکیں در چمن کلاغ آمد جائے بادۂ شیریں زہر در ایاغ آمد
بہر خور دنِ انگور خرس تر دماغ آمد باغ باں بیا بنگر اجنبی بہ باغ آمد
چشم و گوش را روزے گساری نیست
در جبیں ایں کشتی نور رستگاری نیست

بہار نے بھی "وطن من" میں ایران کی بربادی پر اس طرح اظہار افسوس کیا ہے :-

دور از تو گل و لالہ و سرو و سمنم نیست اے باغ گل و لالہ و سرو و سمن من
از رنج تو لاغر شدام چوں نان کزمن تا برنہ شود نالہ نہ بینی بدن من

اشرف رشتی بھی ایران سے اُس کی بہار کے لٹ جانے پر سوال کرتے ہیں :-

اے باغ پرشگوفہ گل و یاسمن چہ شد آں نزہت و طراوتِ سرو و سمن چہ شد
بر عاشقانِ کشتۂ مزار و کفن چہ شد گریاں بحال زار تو مرغ ہوا وطن
بے کس وطن غریب وطن بے نوا وطن

عریاں ز چیست پیکرت اے مادرِ عزیز کو لعل و گنج و گوہرت اے مادرِ عزیز
شد خاک تیرہ بسترت اے مادرِ عزیز نوباوہ گان تو ز غمت در عزا وطن
بے کس وطن غریب وطن بے نوا وطن

ایران کی اس تباہی سے متاثر ہو کر عوام بھی وہاں کی حکومت کے خلاف ہو گئے اور انھوں نے مجبوراً حکومت مشروطہ کا مطالبہ پیش کر دیا۔ چونکہ عوام کا یہ مطالبہ جایز تھا اس لئے اسے متفقہ طور پر عوام کی حمایت حاصل ہو گئی۔ مجبوراً مظفر الدین شاہ قاچار کو ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ایران میں جمہوریت کی بنیاد رکھنا پڑی۔ چنانچہ اشرف رشتی لکھتا ہے :-

شکر می کردیم جمعی کار ہا مضبوط شد ـــــــــــ مملکت مشروطہ شد

لیکن عجیب بات ہے کہ مجلس شوریٰ کا قیام بھی عوام کو مطمئن نہ کر سکا۔ ۱۹۰۷ء میں مظفر الدین شاہ قاچار کی وفات کے بعد اُن کے لڑکے محمد علی شاہ وارث تخت و تاراج قرار پائے۔ لیکن شہنشاہیت کے ماحول میں نشو و نما پانے والے اس فرمانروائے پارلی منٹ کے اختیارات میں دخل اندازی شروع کر دی اور مجلس شوریٰ ایک بے معنی چیز ہو کر رہ گئی۔ اشرف رشتی نے اپنی نظم " بحران کابینہ " میں اس کی طرف واضح اشارہ کیا ہے :-

ہست مدت نہ سال خلق پارلماں دارند ہم بہ آسماں عدل بستہ ریسماں دارند
اندر ایں بہارستاں کعبۂ اماں دارند باز ہر چہ می بینم خلق الاماں دارند
کار ملتِ مظلوم غیر آہ و زاری نیست
در جبیں ایں کشتی نور رستگاری نیست

کابینہ کے بحران اور ایران میں پھیلے ہوئے انتشار کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت اور عوام کے درمیان اختلافات بڑھنے لگے۔ حکومت اور پارلی منٹ کے تعلقات خراب ہونے لگے، ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور ایران ایک مریض جاں بلب ہو گیا۔ ڈیل کے شعار میں اسی حالت کا اظہار کیا گیا ہے :-

مملکت از چار سو در حال بحران و خطر ـــــــــــ چوں مریضِ مختضر
با چنیں دستور ایں رنجور مہجور از شفاست ـــــــــــ درد ایراں بے دواست

پادشہ بر ضد ملت ملت اندر ضد شاہ ——— زیں مصیبت آہ آہ
ہر کسی باہر کسی خصم است و بدخواہ است و ضد ——— گوید اورا مستبد
چوں حقیقت بنگری ہم ایں خطا ہم آں خطاست ——— در دو ایراں بے دواست

آخر کار ایران میں تشدد کا عمل دخل ہو گیا۔ قتل و غارت کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ حالات روز بروز بگڑتے ہی چلے گئے اور ایک دن حکومت نے شاید ۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو پارلیمنٹ پر گولہ باری بھی کی۔ کیا شاعر کیا ادیب کیا لیڈر ہر شخص حکومت کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا، کسی کو جیل میں قید کیا گیا تو کسی کو نظر بند۔ کسی کو پھانسی کا حکم ہوا تو کوئی جلاوطن کیا گیا۔ مرزا جہانگیر خاں مدیر روزنامہ "صور اسرافیل"[1] محمد علی شاہ کے حکم سے "باغ شاہ" میں موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ لیکن جتنا ان سختیوں میں اضافہ ہوتا گیا ملک کا جوش بھی اسی رفتار سے بڑھتا رہا اور اس سلسلہ میں ایران اور بیرون ایران سے شایع ہونے والے فارسی اخبارات نے بھی بڑی اہم خدمات انجام دیں تو بعض اخباروں پر "مجلس"[2]، "حبل المتین"[3] پر مقدمہ بھی چلایا گیا۔ مندرجۂ ذیل اشعار اس سلسلہ کے ملاحظہ ہوں :-

"صور اسرافیل"[1] در "صبح سعادت" دمید ——— ملا نصر الدین رسید
"مجلس"[2] و "حبل المتین"[3] سوئے عدالت رہنماست ——— در دو ایراں بے دواست
ایں جراید ہمچو شپیور و نفیر و کوبناست ——— در دو ایراں بے دواست

آخر کار ظالم حکمراں کو ایران سے فرار ہونا پڑا اور عوام نے محمد علی شاہ کے فرزند احمد شاہ کو بارہ سال کی عمر میں ہی ایرانی تخت و تاج کا مالک بنا دیا۔ مندرجۂ ذیل اشعار اسی پس منظر سے متاثر ہو کر ضبط تحریر میں لائے گئے تھے :-

اے شہنشاہ جواں شیرانِ جنگ آور نگر ——— در نگر ——— عالمی دیگر نگر
ملتی را راحت از مشروطہ سرتاسر نگر ——— در نگر ——— عالمی دیگر نگر
بادشاہی کن کہ دوراں جہاں بر کام تست ——— رام تست ——— شاہ احمد نام تست
در محامد خویش را ہم نام پیغمبر نگر ——— در نگر ——— عالمی دیگر نگر
داد خواہی کن در ایں چوں نوشیرواں ——— در جہاں ——— رخش ہمت بر جہاں
خویش را والاتر از دارا و اسکندر نگر ——— در نگر ——— عالمی دیگر نگر

احمد شاہ کی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد محمد علی شاہ نے روس کی مدد سے اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو واپس لانے کی کوشش کی لیکن اس میں ناکام رہے۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ایک طرف جرمنی تھا اور دوسری طرف برطانیہ۔ پوری دنیا انھیں دو بلاکوں میں منقسم ہو گئی تھی ایران میں بھی رائے عامہ ایک نہ تھی۔ کچھ جرمنی کی حمایت کر رہے تھے اور کچھ برطانیہ کی۔ آخر کار برطانیہ سے ہمدردی کا جذبہ اتنا بڑھا کہ ۱۹۱۹ء میں برطانیہ اور ایران کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا، عوام اس معاہدہ کے مخالف تھے۔ شعراء نے بھی اس کی مخالفت کی۔ پروین اعتصامی کا مندرجۂ ذیل شعر اسی طرف اشارہ کر رہا ہے :-

چو عہد نامہ نوشتیم اہرمن بخندید ——— کہ اتحاد نہ بود ایں کہ با عدو کردیم

---

[1] صور اسرافیل ۱۹۰۷ء میں ایران سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس نے عوام کے ذہنوں میں وسعت پیدا کرنے کی کافی کوشش کی تھی۔
[2] "مجلس" نے بھی "صور اسرافیل" اور "ایران نو" کی طرح اہم خدمات انجام دی تھیں۔
[3] "حبل المتین" ۱۸۹۳ء میں کلکتہ سے نکلنا شروع ہوا تھا۔

اس معاہدے کے خلاف عوام کی عام بیزاری سے روس کو ایرانیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کا نادر موقع ہاتھ آیا۔ اور ۱۹۲۱ء میں روس و ایران ایک دوسرے سے زیادہ قریب آگئے۔ لیکن[1] اس دوستی کے معاہدے پر دستخط ہونے سے پانچ روز قبل ۲۱ فروری ۱۹۲۱ء کو ایران کی کمزور اور متزلزل حکومت کو معزول کر دیا گیا اور کرنل رضا خاں قزوینی کو وزیر حرب بنا دیا گیا۔ وہ ۱۹۲۳ء تک اسی عہدہ پر برقرار رہنے کے بعد فوراً ہی وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر پہونچ گئے اور جب احمد شاہ تاج و تخت کو خیرباد کہکر ایران سے چلا گیا تو ۱۹۲۶ء کے موسم بہار میں پہلوی حکمراں کی حیثیت سے اُن کی رسم تاجپوشی ادا کر دی گئی۔ اور اُن کے بعد اُن کے لڑکے محمد رضا شاہ۔

اس وقت سے موجودہ زمانہ تک ایران میں نہ جانے کتنی وزارتیں بنیں اور فروغی کی وزارت سے منوچہر اقبال کی وزارت تک کتنی تبدیلیاں ہوئیں۔ اور آج بھی جب ہم ایران کی شاعری کے سیاسی پس منظر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں بیچینی کا سراغ ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی آج بھی ایک اچھی جمہوریت کو برسر اقتدار لانے کے لئے جد و جہد کر رہا ہے۔ لیکن اب پہلے سی نشتریت اور زہرناکی ختم ہو چکی ہے۔ اور وہ رہنا بھی نہ چاہئے تھی کیونکہ اب پہلے کی طرح وہاں انتشاری کیفیت نہیں پائی جاتی اور نہ بیرونی طاقتوں کا بظاہر ایسا کوئی اثر ہے۔

دوسری وجہ زہرناکی اور نشتریت کے ختم ہو جانے کی یہ ہے کہ ایرانی ہمیشہ سے نفاست پسند حسن پسند اور نغمۂ ہوشربا کا شیدا رہا ہے۔ اسے جب ذرا سا موقع ملتا ہے تو وہ بڑی خوشی سے ان چیزوں کے دامن میں پناہ لے لیتا ہے، اور حافظ کی والہانہ شاعری کے ہر ہر مصرعہ پر دارفتگی سے سر دھننے لگتا ہے۔ خیام کی رباعیاں اور اُن کا پس منظر ایرانی کے دل و دماغ پر بری طرح چھا جاتا ہے۔ ایرانیوں کی اسی عیش پسندی اور مجہولیت سے برہم ہو کر اشرف رشتی نے بہت ہی سخت طنزیہ نظم "خطاب بہ فرنگیاں" کہی تھی۔ ذیل میں اُس کے چند بند پیش کئے جاتے ہیں:

اے فرنگی از شما باد آں عمارات قشنگ — افتتاح کارخانہ اختراعات قشنگ،
با ادب تحریر کردن آں عبارات قشنگ — جہل بے جا شور و غوغا فحش و تہمت مال ماست
خواب راحت عیش و عشرت ناز و نعمت مال ماست

مال دنیا مار و گنجش رنج و راحت محنت است — نوش او نیش است و سودش درد و شربت ضربت است
اے فرنگی گر از ایں دنیا شما را لذت است — اندر آں دنیا سرور و عیش و لذت مال ماست
حور و غلماں باغ رضواں ناز و نعمت مال ماست

اس وقت موجودہ ایران کے شعرا عام طور سے "غزل" کی طرف مایل ہو چکے ہیں جس میں "غم جاناں" اور "غم دوراں" کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ایرانی کسی وقت بھی جذبۂ حسن پرستی سے غافل نہیں رہے ہیں۔ ادیب پشاوری جنھوں نے اپنی نظموں میں جذبۂ وطن پرستی کو سمو کر ایرانیوں کے دلوں کو گرما دیا تھا۔ جب غزل کہتے تھے تو وہی پرانا رنگ ہوتا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتے انھیں معشوق کا جمال نظر آتا تھا اور لالہ رخ کی بے التفاتی سے اُن کے سینے میں بھی داغ پڑ جاتا:۔

گرفت عرصۂ عالم جمال طلعت دوست — بہر کجا کہ روم آں جمال می نگرم
سحر ببوئے نسیمت بمژدہ جاں سپرم — اگر اماں دہد امشب فراق تا سحرم

---

[1] ڈونلڈ ولبر کی کتاب (Iran past & present) کے صفحہ نمبر ۲۹۰ سے یہ کتاب پرنسٹن یونیورسٹی پریس سے ۱۹۵۸ء میں طبع ہوئی۔

[2] ایرانی مجلس کے ابھی نئے انتخابات ہوئے تھے اس میں منوچہر اقبال کو اکثریت حاصل ہو گئی تھی لیکن شاہ ایران کے ذرا سے شبہ پر منوچہر کو اپنا استعفا پیش کرنا پڑا۔ اب مسٹر شریف امامی جو ۱۹۵۶ء میں وزیر صنعت مقرر ہوئے تھے، وزارت عظمیٰ پر فائز ہو چکے ہیں۔

چناں نہفتم در سینہ داغ لالہ رخے کہ شد چو غنچہ لبالب زخون دل و جگرم

یہی حال مشہور سیاسی شاعر علامہ بہار کا ہے۔ جنھوں نے اپنی تحریر و تقریر سے ادب و سیاست کی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا تھا۔ لیکن جب وہ بھی کچھ دیر کے لئے سیاست سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو محبوب کے تصور ہی میں پناہ لیتے ہیں:۔

حاجی کہ خدا را بحرم جست چہ باشد از پارۂ سنگے شرف اندوزد و دگر ہیچ
خواہی کہ شوی در ہنر استاد زمانہ در مکتب دل عشق بیاموزد و دگر ہیچ
خواہد بدل عمر بہار از ہمہ گیتی
دیدار رخ یار دل افروزد و دگر ہیچ

اسی طرح آزاد ہمدانی کی غزلوں میں عیش پرستی اور حسن پرستی کا جذبہ ملاحظہ ہو:۔

گردش باغ و تماشائے چمن دیدنِ گل بے تو اے سرو گل اندام چہ خواہد بودن
آید و سر نشناسد ز قدم باد صبا گوئی از جانب معشوق خبرہا دارد
وقت است کہ عشقت شورے دگر انگیزم طرحے دگر اندازم رنگے دگر آمیزم
تو غیرتِ خوبانی من حسرت عشاقم فرہادم و شیرینی، شیریں و پرویزم
با یاد تو بنشینم ہر گوشہ کہ بنشینم از شوق تو برخیزم ہر گاہ کہ برخیزم

مرزا یحییٰ خاں ریحاں جو زبردست مارکسی شاعر تھے انھوں نے بھی مادی فلسفۂ جدلیت اور اپنی پوری ترقی پسندی کے باوجود جب غزل سرائی کی ہے تو اس طرح:۔

گر بت پرستاں بنگرند آں سرو سیم اندام را بت خانہ ہا ویراں کنند آتش زنند اصنام را
بودید ہر جا کامراں لے عشق بازان جواں یاد آورید اندر جہاں ایں عاشق ناکام را
خواہی کہ کار آساں شود ریحاں مترس از نیک و بد
عاشق ز سر بیروں کند سودائے ننگ و نام را

اب غمام ہمدانی کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو ایران کا حسرت موہانی کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان دونوں کے کلام اور عملی زندگی میں بہت گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ انھوں نے آزادی کے بعد سیاست سے کنارہ کر لیا تھا اور حسرت آزادی کے بعد بھی سیاست کے مرد میداں رہے۔ غزلیں دونوں نے کہیں دونوں کا رنگ ملتا جلتا ہے سیاست ان دونوں کی شاعری پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ قید و بند کی صعوبتیں دونوں نے برداشت کیں۔ ظلم و ستم کے دونوں ہی شکار رہے، لیکن غزلیں ہمیشہ مسکراتی ہوئی کہیں۔ غمام کے مندرجۂ ذیل شعر ملاحظہ ہوں:۔

گویند کہ باغ ارمے ہست بعالم گر ہست رخ تست وگرنہ ارمے نیست
نہ باغ دیدہ و نہ باغباں تواند دید، گلے کہ در نظر عندلیب می آید،
علاج شورش دیوانگانِ عشق غمام
کجا ز دانش و عقل ادیب می آید

لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ بایں ہمہ وہ اجتماعی حالات سے بے خبر نہیں ہیں اور معاشی و سماجی مسایل پر برابر اظہار خیال کرتے رہتے ہیں۔

مہابھارت پر ایک تحقیقی نظر

(نواب سید حکیم احمد۔ لشکر)

"مہابھارت" سے وہ جنگِ عظیم مراد ہے جو اٹھارہ دن تک قوم "کُرُو" کے سردار "دُریودھن" اور قوم "پانڈو" کے سردار "یُدھشٹر" کے درمیان کسی زمانۂ قدیم میں جاری رہی۔ یہ دونوں "شکنتلا" کے لڑکے راجہ 'بھرت' کی اولاد میں چچازاد بھائی بیان کئے گئے ہیں جس کتاب میں یہ قصۂ جنگ بیان کیا گیا ہے اُس کو بھی "مہابھارت" کہتے ہیں۔

یہ شکل موجودہ مہابھارت ایک ضخیم مثنوی ہے جو اٹھارہ جلدوں اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ اُس میں ایک لاکھ 'شلوک' ہیں، تعداد اشعار کے لحاظ سے دُنیا بھر میں اُس کی ہم پلہ کوئی مثنوی خیال نہیں کی جاتی۔ سب میں بڑی بارھویں جلد ہے جس میں چودہ ہزار شلوک ہیں۔ سب سے چھوٹی کتاب سترھویں جلد ہے، اُس میں صرف تین سو شلوک ہیں۔

اس کتاب کے مکمل قلمی نسخے یورپ اور ہندوستان کے کتب خانوں میں موجود ہیں اور چھپ بھی چکے ہیں۔ اِن نسخوں میں شلوکوں کی کمی بیشی پائی جاتی ہے اور کہیں کہیں عبارت میں بھی فرق ہے لیکن یہ اختلافات اہم نہیں اور اُن کی وجہ یہ خیال کی جاتی ہے کہ بعض نسخے شمالی ہند اور بعض جنوبی ہند میں مرتب ہوئے ہیں۔

مہابھارت کی جلد اول کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب تین مرتبہ شروع کی گئی ہے، پہلے شلوکوں کی تعداد صرف آٹھ ہزار آٹھ سو تھی۔ پھر چوبیس ہزار ہوگئی اور اس کے بعد ایک لاکھ تک نوبت پہونچ گئی۔ محققین کی رائے میں مہابھارت کی موجودہ ضخامت کی وجہ یہی ہے کہ اس عظیم کے متعلق قصّوں کی ابتدائی تدوین کے زمانہ سے کئی سو سال تک اصل کتاب میں اضافے ہوتے رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب کسی کتاب میں صدیوں تک وقتاً فوقتاً اضافے ہوتے رہے ہوں تو ساری کتاب کو کسی ایک مصنف سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال یہ معلوم نہیں کہ اصل کتاب کا مصنف کون ہے اور اضافے کس کس کی تصنیف ہیں۔ مہابھارت کی آخری جلد میں بتایا گیا ہے کہ ایک بزرگ "ویاس" نامی نے ویدوں کی ترتیب کے بعد یہ مکمل مجموعہ 'پانڈوؤں' کی خوبیوں، 'کوروؤں' کی برائیوں اور کرشن مہاراج کی شان و عظمت کے اظہار کے لئے تصنیف کیا تھا اور "وَیشم پایَن" نام کے ایک شخص کو یاد کرا دیا تھا۔ جب "ارجن" کے پوتے "پرکشت" جسے "یُدھشٹر" نے اپنے بعد تخت نشین کیا تھا سانپ نے ڈس لیا اور اُس کے لڑکے "جنمیجیا" نے سانپوں کی پوجا کے لئے رسم قربانی کا اہتمام کیا تو اُس وقت شخصِ مذکور نے راجہ کے سامنے یہ تمام قصّہ دُہرایا تھا۔ واضح رہے کہ "ویاس" کے لغوی معنی محض ترتیب دینے والے ہیں۔

قصۂ جنگِ مہابھارت

بالعموم راسخ الاعتقاد اہلِ ہند کے نزدیک مہابھارت کا اُس تفصیل کے ساتھ جو کتاب میں درج ہے واقع ہونا مسلّم ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں چند متفرق باتوں کا یکجائی اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستان کی قدیم ترین تصنیف رگوید کی بھجن ہیں جو ہزار آٹھ سو سال قبل مسیح سے پیشتر کے زمانہ کی تصنیف ہیں۔ اُن میں بہت سی آریائی اقوام کا ذکر ہے لیکن کُرُو نام کی کسی قوم کا ذکر نہیں ہے اور نہ پانڈوؤں کا۔ حالانکہ رگویدی زمانہ میں ہی فاتح قومیں دریائے 'سارسوتی'

کے اُس علاقہ تک پہونچ چکی تھیں جو دریائے مذکور اور جمنا کے درمیان واقع ہے۔

محققین فرنگ کے نزدیک رگوید کی تدوین کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح قرار پاتا ہے۔ غالباً اُسی زمانہ کے ارد گرد "یجروید" کی تصنیف و تدوین عمل میں آئی ہے۔ اُس کے جغرافیہ میں مشرقی علاقے (بہار وغیرہ) اور دوآبہ شامل ہیں۔ یعنی جب 'یجروید' مرتب ہوا تو آریہ اقوام بنگال اور دوآبہ کی طرف پھیل چکی تھیں۔ دریائے سارس وتی اور جمنا کے درمیان کا علاقہ اس وجہ سے "کروکشیتر" کہلایا جانے لگا تھا کہ وہاں قوم کرو آباد تھی۔ چونکہ اب برہمنی اقتدار قایم ہو چلا تھا اس لئے اُس علاقہ کو 'برہم ورت' بھی کہتے تھے۔ اُس کے آس پاس نیچے کی طرف اور مشرق کی جانب پنچال قوم آباد تھی اور 'متسی و یادو' اقوام متھرا سے دوارکا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن اس وید میں بھی اور پانینی کی کتاب صرف و نحو میں بھی قوم پانڈو کا ذکر نہیں۔ البتہ مہابھارت کے چند نام یدھشٹر۔ دھرت راشٹر وغیرہ دونوں کتابوں میں ضرور پائے جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اگلے زمانہ کی جانی پہچانی شخصیتیں تھیں۔ صرف مہابھارت میں پہلی مرتبہ پانڈو اور پانڈوؤں کا ذکر آیا ہے۔

رگویدی بھجنوں میں بہت سی ایسی چھوٹی بڑی لڑائیوں کا ذکر ہے جو خود آریائی فرقوں کے درمیان داخلہ کے وقت سے دریائے سرستی کے پار پہونچنے تک ہوتی رہتی تھیں۔ ایک جنگ کا نام دس بادشاہوں کی جنگِ عظیم ہے۔ یہ لڑائی دریائے راوی کے کنارے واقع ہوئی تھی۔ ایک فریق چند اقوام پرُوُ، یادو۔ دُرُہیُو وغیرہ پر مشتمل تھا جو راوی کو پار کرکے اس طرف آگے بڑھنا چاہتی تھیں اور دوسری طرف فرقہ 'تِرتُ سُوُ' اور اُس کے حمایتی تھے۔ تِرتُ سُو کے راجہ سُداس نے حملہ کو ناکام کر دیا۔

ایک اور جنگ کا حال رگوید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قوم بھرت نے جو اُس زمانہ کی ایک مشہور و معروف قوم تھی، قوم تِرتُ سُو پر چڑھائی کی۔ رشی وِشوامِتر نے حملہ آوروں کے لئے دریائے بیاس اور دریائے ستلج کو اپنے منتروں کے زور سے پایاب کر دیا تھا لیکن رشی وسشٹھ نے راجہ سداس کی حمایت میں اس حملہ کو بھی ناکام بنا دیا۔

بحالاتِ مذکور واقعۂ جنگ سے متعلق کئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک تو یہی کہ جن لڑائیوں کا رگوید کے بھجنوں میں ذکر ہے اُنھیں میں سے کسی جنگ کو جنگِ مہابھارت کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ یا کوئی اور جنگ رگویدی زمانہ میں ہوئی ہوگی جس کے متعلق یادگار نظمیں کسی وجہ سے رگوید میں شامل نہ ہو سکیں مگر زبانوں پر جاری رہیں۔ یا یہ کہ جس جنگ کو جنگِ مہابھارت کہا جاتا ہے وہ رگویدی بھجنوں کے زمانہ کے بعد واقع ہوئی ہے۔ بہرحال کوئی صورت ہو محققین فرنگ کے نزدیک بھی بلا لحاظ تفصیل قصۂ جنگ مہابھارت کی بنیاد ہی قدیم حادثۂ جنگ ہے، جس کے متعلق نظمیں اور گیت لوگوں کو یاد تھے۔

اس سلسلہ میں اس قدر اور عرض کرنا ہے کہ رگویدی زمانہ کی قومیں یجروید اور مہابھارت کی تصنیف کے زمانہ تک بہت کچھ ادل بدل چکی تھیں۔ مثلاً ابھی بیان کیا گیا ہے کہ ایک مشہور رگویدی فرقہ کا نام بھرت تھا۔ 'بھارت ورش' اور 'مہابھارت' کے نام اسی گروہ سے منسوب ہیں۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ یہ قوم بھی رنگ بدلتی رہی، چنانچہ یجروید وغیرہ میں جس قوم کرو کا ذکر ہے وہ اسی قوم بھرت کی ایک شاخ تھی۔ رہی قوم پنچال تو اس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ وہ رگویدی زمانہ کی ایک قوم 'کیکیی' سے منسوب تھی۔

زمانۂ وقوعِ جنگ مہابھارت

زمانۂ جنگ مہابھارت کی تعیین کرنے میں اس امر کو بہت دخل ہے کہ اقوام آریہ ہندوستان میں کب داخل ہوئیں۔ اگر اقوام مذکور کا ہندوستان سے ازل تعلق ہے یا وہ سن عیسوی سے ہزار دو ہزار سال پیشتر وارد ہوئی تھیں تو اُسی مدت کے اعتبار سے جنگ مہابھارت کے زمانہ کی نسبت قیاس آرائی کو بہت گنجایش ہے۔

مبالغہ آمیز بیانات کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈاکٹر الشیری پرشاد اپنی تاریخ ہند میں بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ مہابھارت کا بہت سا حصہ محض افسانہ ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ بھرت ضرور واقع ہوئی تھی۔ نیز یہ کہ اس جنگ کا پندرھویں صدی

مسیح اور تیرھویں صدی قبل مسیح کے درمیان کسی زمانہ میں واقع ہونا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ مسٹر مزمدار اپنی کتاب ہند و تاریخ میں ظاہر کرتے ہیں کہ یہ لڑائی ۱۳۷۴ ق۔م کے ماہ نومبر و دسمبر میں ہوئی تھی۔

محققین فرنگ کے بیانات کچھ مختلف ہیں۔ اُن کے نزدیک آریہ اقوام کے ہندوستان میں داخل ہونے کا زمانہ بارھویں صدی قبل مسیح کے آس پاس کا زمانہ ہے۔ اگر اس زمانہ کو وسعت بھی دی جائے تو بقول پروفیسر میکڈونل وہ پندرھویں صدی قبل مسیح سے آگے نہیں بڑھایا جاسکتا۔ پروفیسر موصوف کی رائے میں بھی کوئی ایسی جنگ ضرور تھی جس پر قصۂ جنگ مہا بھارت مبنی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ جنگ غالباً دسویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ ہوئی ہے۔ اپنی اس رائے کی تائید میں منجملہ دیگر دلایل کے ایک دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ یجروید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کُرو اور پنچال قومیں یجروید کے زمانہ میں متحد ہو چکی تھیں۔ لہٰذا ان دونوں قوموں کے جنگ کا زمانہ یجروید کی تدوین کے زمانہ سے بہت پیشتر کا ہونا چاہیئے۔ بعض فرنگی مصنفین کی رائے میں اگر یہ جنگ ہوئی ہے تو اُس کا زمانہ وقوع بھگوان بدھ کے بعد کا کوئی ایسا زمانہ ہونا چاہیئے جب اصلی فرقے کرو، پنچال وغیرہ قوموں میں تبدیل ہو چکے ہیں اور متھرا، بنارس اور کروکشیتر کا علاقہ مقدس و متبرک قایم ہو چکا ہے یعنی ہزارھویں نویں صدی قبل مسیح کے بعد کا کوئی زمانہ۔

کتاب مہا بھارت کی تصنیف کا زمانہ

ابھی بیان کیا گیا ہے کہ مسٹر مزمدار کے نزدیک جنگ مہا بھارت ۱۳۷۴ ق۔م میں ہوئی تھی۔ صاحب موصوف مزید بیان کرتے ہیں کہ اُسی زمانہ میں ویاس رشی نے وقت کے وقت ویدوں کو ترتیب دینے اور 'پرانوں' کو تصنیف کرنے کے بعد حالاتِ جنگ پہلے آٹھ ہزار آٹھ سو شلوکوں میں اور بعد کو چوبیس ہزار شلوکوں میں بیان کر دئے۔ ویاس کے لغوی معنی ملحوظ خاطر رہیں۔

ڈاکٹر ایشوری پرشاد یہ کہکر کہ مہا بھارت کی تصنیف کا زمانہ متعین کرنا بہت مشکل ہے انداز یہ طریق پر بیان کرتے ہیں کہ اس کتاب کی تصنیف غالباً ساتویں یا چھٹی صدی قبل مسیح سے شروع ہوئی اور سن عیسوی سے دو تین سو سال بعد تک اُس پر متعدد بار نظر ثانی ہوتی رہی جس کے نتیجہ میں اُس کی ضخامت میں اضافہ ہوتا رہا۔

پروفیسر وِنٹر نِٹز کی رائے میں یہ کتاب سن عیسوی کے بعد تصنیف و مدون ہوئی ہے کیونکہ علاوہ دیگر دلایل کے شرکاء جنگ میں یونانیوں، ایرانیوں وغیرہ کا ذکر ہے۔ صاحب موصوف کی تحقیقات کے مطابق 'پانینی' کی کتاب صرف و نحو مہا بھارت سے پہلے کی ہے، چونکہ کتاب مذکور چوتھی صدی قبل کے حصۂ آخر میں یعنی تقریباً سکندر کے حملہ کے زمانہ کے آس پاس تصنیف ہوئی ہے اور اُس میں کتاب مہا بھارت کا ذکر نہیں ہے اس لئے پروفیسر موصوف کے نزدیک مہا بھارت کی داستان یونانی حکومت کے دور کے بعد ہی کے زمانہ کی تصنیف ہوسکتی ہے۔

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ یہ کتاب بہ شکلِ موجودہ کئی مرحلوں میں مرتب ہوئی ہے۔ پروفیسر میکڈونل ان کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ ابتداءً کسی شاعر نے متفرق یادگار نظموں اور گیتوں کو اکٹھا کر کے جنگ مہا بھارت کی ابتدائی داستان مرتب کی۔ نیز یہ کہ ابتدائی قصۂ جنگ اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ کُرو برادران حق بجانب تھے مگر پانڈوؤں کی چالاکی اور فریب سے جنگ میں مبتلا ہوکر تباہ و برباد ہوگئے۔ مرحلۂ اول کی اس تصنیف کو صاحب موصوف پانچویں صدی قبل مسیح سے منسوب کرتے ہیں اور یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس ابتدائی داستان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں وہ تصنیف ہوئی اُس زمانہ میں رگویدی عقاید کی جگہ وشنو، شیو اور برہم کی تثلیث قایم ہو چکی تھی اور برہم کو خداوند اکبر مانا جاتا تھا، اور یہ خصوصیت پانچویں صدی قبل کے زمانہ کی تھی۔ مزید یہ کہ ایک اور کتاب "اشولائن گرہ سوتر" میں جس کی تصنیف اسی زمانہ سے یا اُس سے متصل زمانہ سے متعلق ہے، بھارت اور مہا بھارت کا ذکر ہے۔

اس کے بعد بقول صاحب موصوف دوسرا مرحلہ وہ ہے جس میں داستانِ جنگ کو ترمیم کیا گیا اور شلوکوں کی تعداد آٹھ نو ہزار سے

بیس ہزار ہوگئی - ترمیم کی رو سے کُرو خاندان کو مفتری اور پانڈوؤں کا سرپرستی کرشن مہاراج راہ راست پر ہونا قرار دیا گیا - یہ زمانہ ہے جب پانچویں صدی کے بعد برہم کی جگہ وشنو اور شو خداوندانِ اکبر کی حیثیت سے کارفرما نظر آتے ہیں اور کرشن مہاراج وشنو کے اوتار مانے جاتے ہیں -

اس کے آگے کا مرحلہ وہ سمجھنا چاہئے جس میں پروفیسر میکڈونل کی رائے کے مطابق براہمنی عقاید و دستور سے متعلق نظریاتی، فلسفیانہ، سیاسی اور مذہبی قسم کے مضامین اضافہ ہوتے رہے - میگستھنیز، سفیر یونان کا بیان ہے کہ اُس کے زمانہ میں وشنو اور شو کی پرستش عام تھی اور اُن کے نام پر جابجا مندر موجود تھے - اس سفیر کا زمانہ سن تین سو قبل مسیح کے آس پاس کا زمانہ تھا، مطلب یہ کہ یہ اضافے اسی زمانہ سے منسوب کئے جاسکتے ہیں -

بعد کے مرحلات وہ ہیں جن میں مزید اضافے بقول پروفیسر میکڈونل سن عیسوی کے آغاز تک یا بقول ڈاکٹر ایشری پرشاد اُس کے بعد تک ہوتے رہے اور شرکا، جنگ میں یونانیوں اور اقوام "پارتھیا دستھیا" وغیرہم کو بھی شامل کیا گیا -

کتاب کی قدر و قیمت

بیرونی مواد کے داخل ہونے کا سبب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سارا زمانۂ تصنیف براہمنی اقتدار کا زمانہ تھا - اصل داستانِ مہابھارت جنگی طبقات کے سرداروں اور بادشاہوں کے کارناموں اور اعمال سے متعلق تھی اور خواص و عوام میں بہت مشہور و مقبول تھی - اُس کی شہرت اور مقبولیت سے فایدہ اُٹھانے کی یہ صورت پیش نظر آئی کہ براہمنوں کے فضل و کمال و عظمت اور دینی عقاید سے متعلق بیانات اُس داستان میں شامل کردئے جائیں تاکہ وہ دینی و دنیوی ہدایات پر مشتمل دستور العمل بن جائے - چنانچہ یہی شکل اس وقت کتاب مہابھارت کی ہے - یعنی اُس میں دیوتاؤں اور حکمراں طبقہ کے قصوں اور پشت ناموں کے ساتھ ساتھ براہمنوں کی شان و عظمت کا بھی بیان ہے - مذہبی عقاید کی تشریح بھی موجود ہے - چار گانہ زندگی بسر کرنے کے طریقوں کا بھی ذکر ہے اور وجودِ کائنات سے متعلق قصے اور فلسفیانہ نظرئے بھی شامل ہیں - اور راجوں مہاراجوں کے لئے پند و نصائح کا ایسا ذخیرہ بھی مہیا کیا گیا ہے جس سے طبقۂ اعلےٰ کی سیاسی شان و عظمت بھی نمایاں ہو - یہ مضامین اصل کتاب میں اس طرح سمو دئے گئے ہیں کہ قصۂ جنگ کو یکبارگی مسلسل پڑھنا اور سمجھنا دشوار ہے - ایک بیّن مثال اس بیرونی مواد کی، وہ کتاب ہے جس کو "بھگوت گیتا" کہتے ہیں - اس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ جب دونوں مخالف فوجیں آمنے سامنے کھڑی تھیں اُس وقت یہ پوری فلسفیانہ نظم ارجن کو سنائی گئی تھی کیونکہ وہ اپنے عزیزوں سے لڑنا نہیں چاہتا تھا -

یہ تبلیغی کوشش نہایت کامیاب ثابت ہوئی اور یہ کتاب دینی و دنیوی فرایض کی راہ نما سمجھی جانے لگی - خود اس کتاب میں ایسے احکام موجود ہیں جن کے مطابق "نیک اشخاص کو چاہئے کہ وہ مقدس کلام کے اس ذخیرہ کو جس میں گائے اور برہمن کی عظمت کا سراہا گیا ہے ہمہ تن غور ہو کر سنیں" غرضکہ جیسے جیسے اُس میں اضافے ہوتے گئے اُس کو زمانۂ قدیم ہی میں درجاتِ تقدس حاصل ہوتے رہے اور یہ عقیدہ راسخ ہوتا گیا کہ وہ مقدس "سمرتی" کا مرتبہ رکھتی ہے یعنی ایک طرح کی آسمانی کتاب ہے - اس معنی میں اُس کو "کرشن کا وید" بھی کہتے ہیں اس لئے کہ اُس کا بیشتر حصہ وشنوی عقاید سے متعلق ہے - عقیدۂ تناسخ نے بھی یہ صورت اختیار کرلی کہ خداوند وشنو، حیوانی اجسام میں حلول کرکے دنیا میں نمودار ہونے لگے - حلول کی حد سے بھی گزر کر اوتاری عقیدہ کو یہ مرتبہ حاصل ہوگیا کہ خداوند وشنو کرشن مہاراج کے جسم میں داخل نہیں ہوئے بلکہ کرشن مہاراج خود خداوند وشنو ہے - اس بنا پر کہ اسمیں اُنہا وصفت خداوند وشنو اور اُن کی زوجہ "سارس وتی" کی کی گئی ہے ..... یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ یا اُس کا اکثر و بیشتر حصہ وشنوی متبعین کی تصنیف ہے اور اُن کی کتاب عقیدت و عبادت ہے -

مختصر یہ کہ محققین کے نزدیک اصل قصۂ کتاب میں اضافہ حیاتِ مابعد براہمنوں کی تدبیر و فراست کا نتیجہ ہیں جنھوں نے آہستہ آہستہ رزمیہ داستان کو "دھرم" کی شکل میں منتقل کردیا اور "دھرم" کی یہ صورت قایم کی گئی کہ (۱) براہمنی ادارے

یم - دستور - عقائد (۲) ذات پات کی تقسیم اور (۳) عام و خاص کا برہمنوں کے اقتدار حکم کا پابند ہونا۔ مقدس آسمانی ہدایات پر
ہیں - غرض کہ کتاب مہابھارت دینی و دنیوی عقائد و رسوم کی انسائکلو پیڈیا بنا دی گئی اور اُس کا مقصد یہ قرار پایا کہ جن لوگوں
لئے "ویدوں" کا مطالعہ ممنوع ہے یا جو اُن سے مستفیض نہیں ہو سکتے وہ اس کتاب سے جو مقدس سمرتی کا مرتبہ رکھتی ہے
یم و تربیت حاصل کریں۔

یہ نتیجہ کہ مہابھارت جس شکل میں آج موجود ہے عیسوی ابتدائی صدی کے آگے پیچھے مرتب مکمل ہو چکی تھی اور اُس کا شمار
دس صحیفوں میں ہونے لگا تھا بعض بیرونی شہادتوں پر بھی مبنی ہے - مثلاً ۶۲ء سے ۶۰۰ء تک کے زمانہ کے ایسے کتبے اور
لے پائے جاتے ہیں جن میں عام طور پر کتاب مہابھارت کو 'سمرتی' (روایات مقدسہ) یا دھرم شاستر مانا گیا ہے - یہ عقیدہ اُس
تک نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ کتاب مذکور عوام و خواص میں رائج و مقبول نہ ہوتی اور اضافجات شامل نہ ہوتے - اس عام رواج اور
ولیت کے یہ معنی ہوئے کہ چوتھی پانچویں صدی عیسوی سے کچھ صدیاں پیشتر ہی سے اس کتاب کی ترویج شروع ہو گئی ہو گی کیونکہ ایسے
نہ میں جب چھاپہ خانے موجود نہ تھے عقائد و رسوم کی بنیاد قایم و مستحکم ہونے کے لئے مدتِ کثیر کی ضرورت ہے -

۶۰۰ء سے بارھویں صدی عیسوی تک کی شہادتیں بھی بکثرت موجود ہیں کہ یہ کتاب اپنی موجودہ شکل میں مقدس و متبرک
جاتی تھی - یہ شہادتیں وہ کتابیں ہیں جو مختلف مصنفین نے اس زمانہ میں لکھی ہیں - ساتویں صدی عیسوی کا مشہور شاعر 'بان' ہے -
نے مہابھارت کی سب جلدوں کی کہانیوں سے استفادہ کیا ہے - وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ اوجین کے 'مہاکال' مندر میں مہابھارت
لاوت کی جاتی تھی اور اُس وقت اُس کتاب میں 'بھاگوت گیتا' بھی شامل تھی - ایک اور مصنف آٹھویں صدی عیسوی کا "کمارلا"
جس نے اپنی تفسیر میں مہابھارت کو بہت قدیم اور متبرک 'سمرتی' بیان کیا ہے - اُس کے نزدیک یہ محض جنگ کا قصہ نہیں ہے بلکہ
چاروں ذاتوں کی دینی اور دنیوی تعلیم کی مقدس کتاب ہے - نیز یہ کہ جنگ کے ذکر سے تو صرف چھتری ذات کے لوگوں میں جذبات
دری اُبھارنا اور برقرار رکھنا مقصود ہے - ۸۰۲ء میں مشہور ویدانتی فلسفی "شنکر آچاریہ" نے مہابھارت کی شرح لکھی اور ظاہر
یہ کتاب مقدس 'سمرتی' ہے اور اُن لوگوں کی دینی تعلیم کے لئے مرتب ہوئی ہے جو 'وید' اور 'ویدانتا' نہیں پڑھ سکتے - گیارھویں
ی عیسوی میں ایک کاشمیری شاعر "شمیندر" نامی نے مہابھارت کا منظوم خلاصہ تصنیف کیا - بعد کے زمانہ میں اور بھی تفسیریں مکمل
ب کی لکھی گئیں جن میں "سروینہ ناراین" (تیرھویں یا چودھویں صدی عیسوی) اور "نیلکنٹھ" (سولھویں صدی عیسوی) کی شرحیں
ے مشہور ہیں - اس کتاب کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اُس کا ترجمہ شہنشاہ اکبر کے حکم سے
بدالقادر بدایونی اور نقیب خاں نے فارسی میں کیا تھا - فیضی کے نام سے بھی 'بھاگوت گیتا' کا منظوم ترجمہ منسوب ہے - غرض کہ
دی سن سے زمانۂ حال تک مہابھارت بصورت موجودہ مقدس اور متبرک دھرم شاستر کے طور پر تسلیم ہوتی چلی آئی ہے - آج بھی
ال ہے کہ یہ کتاب مندروں میں اور عقیدت مند حلقوں میں نہایت ذوق و شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہے -

حال ہی میں یہ خبر شایع ہوئی ہے کہ 'بھنڈارکر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پونہ' کی جانب سے کتاب مہابھارت کا ایک جدید اڈیشن
ہو رہا ہے - اہتمام یہ کیا گیا ہے کہ سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں جتنے مختلف نسخے رائج ہیں - نیز جتنے ترجمے یا خلاصے
زبانوں مثلاً فارسی - انگریزی - جاوائی وغیرہ میں ہوئے ہیں اور جتنی شرحیں لکھی گئی ہیں اُن سب کا جایزہ لے کر تنقید کے ساتھ مکمل
ں کا مستند اڈیشن شایع کیا جائے - یہ کام ۱۹۱۹ء سے شروع ہوا ہے اور ابھی ایک یا دو جلدوں کا کام باقی ہے جو عنقریب پورا
ہو سکے گا - اس وقت تک اس کام پر پندرہ لاکھ روپیہ صرف ہو چکا ہے -

آسودگانِ خاک

آتش و ناسخ و میر

(شیخ تصدق حسین)

۱۴ مارچ ۱۹۶۱ء کے قومی آواز میں جناب ڈاکٹر محمد احد کریم صاحب نے بہ صیغہ مراسلات تحریر فرمایا ہے کہ آتش و ناسخ کے مزار جو محلہ گنو گھاٹ متصل درگاہ شاہ نصیر اللہ شاہ واقع ہیں، اس سال سیلاب میں انھیں نقصان پہونچ گیا ہے اور قابل مرمت ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد ۱۷ مارچ کو نادم سیتا پوری صاحب کا جوابی مراسلہ شایع ہوا جس میں موصوف نے تحریر کیا ہے کہ جہاں تک ناسخ کی قبر کا تعلق ہے وہ تو ان کے خاندانی قبرستان گنو گھاٹ میں ہے لیکن آتش کی قبر گنو گھاٹ میں نہیں ہے، خواجہ عبدالرؤف عشرت نے تذکرہ آب بقا میں لکھا ہے کہ "اپنے مکان چڑھائی مادھو لال چوپٹیوں کے قریب ہی دفن کیے گئے، اب سے ۳۰ - ۳۵ سال اُدھر ہی ان کی قبر کا نشان مٹ چکا تھا۔

"مادھو لال کی چڑھائی، ۴۰ - ۵۰ برس پہلے اس جگہ پر بھی جہاں چونے کی بھٹی تھی۔" آگے چل کر موصوف تحریر کرتے ہیں کہ "میر تقی میر کی قبر امامباڑہ آغا باقر میں ہے، مجھ ناچیز کی تحقیق میں گنو گھاٹ کے قبرستان میں نہ ناسخ کی قبر ہے نہ آتش کی۔ وہاں صرف ناسخ کے زیر خاک ابدی نیند سو رہے ہیں اور ان کے مدفن پر یہ مصرع بھی کندہ ہے:-

گور پدر خلیل ناسخ

اس قبر کے علاوہ وہاں ناسخ کا کوئی خاندانی قبرستان بھی نہیں ہے۔

مزار آتش مزار آتش کے بارے میں شاید نادم صاحب کے حافظہ نے دھوکا دیا۔ ورنہ خواجہ عبدالرؤف عشرت نے تذکرہ "آب بقا" میں خواجہ حیدر علی آتش کی قبر کے حالات بہت صحیح صحیح قلم بند کئے ہیں تذکرہ کے صفحہ ۱۳ پر وہ تحریر کرتے ہیں "نواز گنج کے قریب سے آگے مادھو لال کی چڑھائی مشہور ہے (اصل نام مادھو لال تھا) مادھو کے بجائے مادھو، شاید کاتب صاحب کی غلط فہمی کا نتیجہ ہو۔ مادھو لال کے مفصل حالات میں اپنی کتاب "بیگمات اودھ" میں زیر عنوان "ٹاٹ محل" درج کر چکا ہوں۔ (راقم مضمون ہذا) وہاں سے "آثار" کو ایک چھوٹا باغیچہ اور ایک کچا سا مکان تھا وہ آتش نے خرید لیا اور اُسی میں رہنے لگے"۔

غالباً اسی باغیچہ کی رعایت سے آتش کی رحلت پر کسی نے کہا تھا:-

نسیم صبح برساتی ہے واں پھول
جہاں پر لاش آتش کی گڑی ہے

ناسخ کے انتقال کے نو برس بعد ۱۲۶۳ھ میں آتش نے بھی اس جہانِ فانی سے کوچ کیا منشی اشرف علی اشرف نے ان کی تاریخ وفات کہی ہے مادہ "بمرد شاہ سخن" ہے خواجہ محمد بشیر راوی تھے کہ "ہم بہت کم تھے صفر کا مہینہ تھا۔ ۱۸۴۷ء تھا۔ آتش کی بیماری کی خبر مشہور ہوئی رکن الدین کے ساتھ ہم بھی آتش کی عیادت کو گئے اُس زمانہ میں واجد علی شاہ کا عہد سلطنت تھا اور اُسی سال سریر آرائے سلطنت

پا مکان تھا۔ اس پر ایک چھپر پڑا ہوا۔ تقریباً اسّی بیاسی برس کا ایک آدمی، چاروں ابرو کا صفایا، رنگ کھلتا ہوا، چارپائی پر لیٹا تھا دریافت کرنے پر معلوم ہوا یہی آتش ہیں، کچھ منہ سے کہنا چاہتے تھے۔ مگر آواز نہ نکل سکی، شاگرد لوگ نزکل کی چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، ہم لوگ تھوڑی دیر تک کھڑے رہے، پھر چلے آئے، اس کے آٹھ روز بعد سُنا کہ آتش کا انتقال ہوگیا اور "اپنے مکان" میں دفن کئے گئے۔"

خاکسار کا مکان مسکونہ عرصۂ دراز سے محلۂ چوپٹیاں میں ہے اس لئے یہاں کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ سے واقفیت ہے، راہو لال کی چڑھائی جوانے کی بھٹی نہ کبھی دیکھی تھی نہ سُنی نہ یہاں کی گنجان آبادی میں بھٹی کی گنجائش ہی تھی، البتہ یہاں راجہ جیالال متخلص بہ گلشن کی دولتسرا و فیل خانہ دیگر املاک بھی، راجہ صاحب کو خواجہ آتش ہی سے تلمذ تھا، جو ان کی حویلی سے قریب ہی چڑھائی راہو لال کے آثار پر قیام پذیر تھے۔

راجہ صاحب کی یادگار ایک عالی شان پھاٹک لب سڑک اب تک موجود ہے۔ ۱۹۱۴ء کی ہتھیا کی قیامت خیز بارش نے شہر کے لاتعداد مکانوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور بے شمار افراد گھر سے بے گھر ہوگئے تھے، چنانچہ بارش کی تباہ کاریوں کے بعد سڑک چوپٹیاں وسیع کی گئی اور چڑھائی راہو لال کی آراضی "گلکر پارک" میں شامل کردی گئی اس وقت سے یہ راستہ بند کر دیا گیا۔

اب مکان مسکونہ آتش کی راہ منا دیوی کے مندر کی طرف سے ہے اور اس کی آراضی مندر کے ملحق جانب مشرق واقع ہے۔

یہ آراضی اور مندر آخر میں پنڈت رگھبر دیال گوڑ کے قبضہ میں تھے۔ انھوں نے لاولد قضا کی۔ ان کے بعد متوفی کے دو بھائی قابض ہے، اب یہ دونوں بھی رحلت کر چکے ہیں، ان کی ذریت ہر دوئی میں موجود ہے اور وہی لوگ قابض جائداد متذکرہ ہیں، مکان کی حد بندی لئے گلی کی طرف ایک پختہ دیوار اور دروازہ موجود ہے مگر دیوار کے اندر یہ عبرت خیز اور حسرت ناک منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے کہ آراضی ادہ پڑی ہے جس پر سیکڑوں من خاک کا انبار ہے۔ اس مٹی کے ڈھیر کے نیچے کسی جگہ آتش جیسا باکمال اور مایۂ صد افتخار شاعر محو خواب ابدی گمنام قبر بے نشان ہوکر رہ گئی ہے۔

مزار ناسخ ٹکسال وسط چوک بازار لکھنؤ میں ایک قدیم محلہ ہے جس میں شیر شاہ سوری کے عہد دولت میں تانبے کے سکے اور اکبر اعظم کے دور زریں میں چاندی کے سکے ڈھالے جاتے تھے۔ شیخ امام بخش ناسخ نے فیض آباد میں جنم لیا اور ۱۱۹۱ھ میں نواب آصف الدولہ زمانہ میں ترک وطن کرکے لکھنؤ آئے۔ یہاں ایک رئیس میر کاظم علی نے ناسخ کو اپنا بیٹا بنالیا۔ میر کاظم علی کے انتقال پر ایک کثیر رقم ناسخ ہاتھ آئی اور انھوں نے ٹکسال میں ایک مکان خرید کر اپنی بود و باش اختیار کرلی۔

موصوف مذہباً اثنا عشری تھے اور فساد خون کی بیماری میں مبتلا رہتے تھے اسی کہنہ مرض کی شدت سے ۱۲۵۴ھ میں رحلت کی اور یہی مکان مسکونہ واقع ٹکسال میں مدفون ہوئے، ان کی قبر موافق اصول مذہب شیعہ زمین دوز بنائی گئی تھی۔ ان کے ورثا نے اس مکان دہ کردیا۔ اس وقت سے یہ مکان کئی مشتریوں کے قبضہ میں گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

نادم صاحب سیتاپوری نے بحوالۂ تذکرۂ "آب بقا" خواجہ آتش کے حالات تحریر کئے ہیں۔ اُسی میں ناسخ کے مرقومہ بالا حالات و واقعات صفحات ۱۲۹ لغایتہ ۱۳۰ میں پائے جاتے ہیں۔

اس کے ماورا سید جالب صاحب دہلوی مدیر روزنامہ ہمت نے بھی اپنے اخبار کی ۲۰ اپریل ۲۹ء والی اشاعت میں تحریر کیا تھا کہ سن لکھنؤ کے مایۂ ناز سخنور جناب ناسخ کی قبر محلہ ٹکسال کے ایک مکان میں دبی پڑی ہے اور ان کے زبردست ہمعصر حضرت آتش کی قبر بھی ایک مقام پر کس مپرسی کے عالم میں ہے۔"

اس کے علاوہ اگر کوئی صاحب مزار ناسخ مرحوم کی زیارت کرنا چاہتے ہیں تو وہ ٹکسال جاکر مدرسۂ قدیمہ کے بالمقابل ایک مکان میں مشاہدہ کرسکتے ہیں جس میں نشان قبر اب تک موجود ہے۔

تبصرہ مزار میر جناب نادم سیتاپوری کی تحقیق میں امامباڑۂ آغا باقر میں تھا مگر موصوف نے کوئی تاریخی سند اپنے قول کی تائید میں پیش نہیں کی ہے ۔۔۔ اہل لکھنؤ کا خیال اس بارے میں مختلف ہے۔ چنانچہ سید جالب مرحوم جیسے محقق اعظم اور مدیر روزنامہ

ہمت نے اخبار مذکور کی ۲۰ر اپریل ۲۹ء کی اشاعت میں اپنی تلاش و جستجو کا نتیجہ ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا کہ "ہماری یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ اپنی زبان کے سب سے بڑے شاعر (میر علیہ الرحمۃ) کے مزار کا بھی ہم تحقیق کے ساتھ نشان نہیں دے سکتے۔"

تیس برس سے زیادہ عرصہ گزرا جب میرے ایک دوست سید شہنشاہ حسین ایم۔ اے ایڈوکیٹ و اڈیٹر ماہ نامہ "خیاباں" نے بھی جو مرحوم ہو چکے ہیں، مزار میر کا پتہ چلانے میں بڑی کاوش کی تھی اور اسی زمانہ میں ایک کتابچہ بھی بنام "ہم گورِ غریباں میں" شایع کیا تھا۔ ان سب حضرات کے اقوال درج کر دئے تھے جنھیں مزار مذکور کی کچھ بھی واقفیت تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ میر امام آغا باقر میں مدفون ہیں۔ شہنشاہ صاحب کی تحقیق کا نچوڑ یہ تھا کہ:۔ "میر کی قبر مصری کی بغیہ میں تھی اور اب اس کا نشان باقی نہیں یا اگر ہے تو جاننے والا کوئی نہیں۔" اس وقت سے یہ فیصلہ اس مسئلہ میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے، نتیجہ مذکورہ سے جناب جالب صاحب نے بھی اتفاق کیا اور ہمت کی ۵ر مئی ۱۹۲۹ء والی اشاعت میں حسب ذیل تبصرہ کیا تھا، سید شہنشاہ حسین رضوی نے مزار میر کی مختلف مقامات میں نشان دہی کی شہادتوں پر خواہ مکتوبی ہوں یا زبانی جو اس وقت میسر آسکتی ہیں۔ غائر نگاہ ڈالی ہے اور آخر میں حضرت میر (علیہ الرحمہ) کی قبر کے مصری کا باغیچہ ہونے کا نتیجہ نکالا ہے۔ مصری کی بغیہ جو نواب آصف الدولہ کی معشوقہ کے نام سے منسوب ہے، لکھنؤ کا بہت پرانا قبرستان ہے اور طبقۂ امرا و اکثر ارکان وہاں دائمی خواب راحت میں آسودہ ہیں۔ شیخ محمد جان شاد مرحوم پیرو میر کی نسبت اڈیٹر ہمت نے متعدد مستند احباب سے یہ روایت ہے کہ آخر عمر انھوں نے تحسین گنج کے مقابل ایک امام باڑہ غالباً امام باڑہ الماس علی خاں میں اس غرض سے اقامت اختیار کر لی تھی کہ یہاں اپنے روحانی استاد حضرت میر کی قبر پر وقتاً فوقتاً جانے میں سہولت بہم پہونچتی تھی یہ ایک حسرت خیز اور عبرت انگیز بات ہے کہ سوا صدی کے بعد اس مقام سے بے نشان ہو گیا ہے، جو زبان اردو کا عظیم الشان مرکز ہونے پر فخر کرتا ہے۔ اس ٹھوس تاریخی شواہد کی روشنی میں ہم یہ باور کرنے مجبور ہیں کہ حضرت میر کی قبر مصری کی بغیہ میں تھی نہ کہ امام باڑہ آغا باقر میں، مگر ہماری ہی غفلت و لاپرواہی سے اب وہ بے نشان ہو کر رہ گئی ہے۔

ورسٹڈ ویونگ اور ہوزری یارن
کی
ضروریات کی تکمیل کے لئے، یاد رکھئے
حرفِ آخر
کپور سپن
KAPURSPUN
ہی ہے
تیار کردہ۔ کپور سپننگ ملز۔ ڈاک خانہ رآن اینڈ سلک ملز۔ امرتسر

بازنطینی دورِ حکومت کی تاریخ کا ایک پوشیدہ ورق

خون کا دھبہ اور پیمانِ عصمت

(نیاز فتحپوری)

خادمہ، ملکۂ تیودورا کے حضور میں آئی، جھک کر آداب بجالائی اور آگے بڑھ کر ملکہ کے کان میں آہستہ سے کہا:۔

—— "میکائیل"

تیودورا نے اپنا سر اُٹھایا اور پوچھا "بڑا یا چھوٹا؟"

خادمہ نے جواب دیا "ملکۂ عالم، بڑا"

ملکہ نے کہا "اندر بلا لو" —— خادمہ چلی گئی

ملکہ نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر، چیتے کو جو اس کے قدموں پر پڑا سو رہا تھا، قریب کے پنجرہ میں لیجا کر بند کر دیا۔ اور لوٹ کر اس کمرہ میں جس کا دریچہ سمندر کی طرف کھلتا تھا، مخمل و حریر کے گدوں اور تکیوں پر جا کر لیٹ رہی۔

اسی وقت ایک کشیدہ قامت نوجوان اندر داخل ہوا، جس کی آنکھیں نیلگوں تھیں اور بال بھورے۔ یہ دو زانو ہوا، ملکہ نے اپنا خوبصورت ہاتھ آگے بڑھایا اور اس نے اپنے لبوں سے لگا لیا۔ اس کے بعد ملکہ نے اپنی آغوش کھولدی اور یہ اظہارِ شیفتگی اس کے سینہ و گردن، شانہ و رخسار تک پہونچ گیا۔

میکائیل نے انتہائی حزن و ملال کے ساتھ کہا:۔ "کیا یہ صحیح ہے کہ ملکۂ عالم اب میری حاضری کو پسند نہیں فرماتیں اور قصر کے اندر میرا آنا شاق گزرتا ہے۔ اگر یہ غلط نہیں ہے تو کیا میں اس کا سبب معلوم کر سکتا ہوں، کیا مجھے بتایا جا سکتا ہے کہ عنایات شاہانہ میں یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا؟"

تیودورا نے میکائیل کا سر اپنے ہاتھوں پر سنبھال کر کہا:۔ "اے میکائیل، میرے دل میں تیری محبت بدستور قایم ہے، لیکن کبھی کبھی واقعات و حالات کچھ ایسے پیدا ہو جاتے ہیں، کہ اُن کا لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے

تجھے معلوم ہے کہ اس قصر میں داخل ہونے سے قبل، سلطنت بازنطینی کی ملکہ بننے سے پہلے ہی میں تجھ سے محبت کرتی تھی، اور ملکہ ہونے کے بعد بھی کوشش جاری رکھی کہ تو آزادی کے ساتھ مجھ سے ملتا رہے، لیکن اب ایک واقعہ ایسا پیش آیا ہے کہ میں اپنے اور تیرے دونوں کے انجام سے ڈرنے لگی ہوں"

میکائیل —— "وہ کیا حادثہ ہے"

ملکہ —— "چند دن ہوئے تیرا بھائی آیا اور مجھ سے ملنے کی درخواست کی، چونکہ اس کا نام بھی میکائیل ہے، اس لئے میں نے یہ سمجھ کر کہ یہ تو ہی ہے اندر آنے کی اجازت دے دی"

میکائیل —— (گھبرا کر) پھر کیا ہوا۔

ملکہ ـــــ "اُس نے مجھ سے اظہارِ محبت کیا"

میکائیل ـــ "پھر"

ملکہ ـــــ "میں نے اس سے کہا کہ فوراً یہاں سے نکل جاؤ، لیکن اس نے جاتے ہوئے غضبناک ہوکر کہا کہ "میرے اور تیرے تعلق کو وہ تمام شہر میں مشتہر کردے گا اور بادشاہ سے بھی جاکر کہے گا۔" اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تو اس وقت تک قصر میں آمد و رفت بند کردے، جب تک ....."

میکائیل ـــ "جب تک ؟"

ملکہ ـــــ "ہاں، جب تک تیرا بھائی اس ارادہ سے باز نہ آجائے یا راستہ بالکل صاف نہ ہوجائے، میکائیل نے یہ سُنا اور انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں دیوانہ وار وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔"

تیودورا کا باپ جانوروں کا ڈاکٹر تھا اور اس کی ماں کا نام کسی کو کبھی معلوم ہی نہیں ہوا کہ وہ کون تھی اور کیا تھی جب اس کا باپ مرگیا تو وہ بہت کمسن تھی، دُنیا اُس پر تنگ ہوئی تو حصولِ معاش کے لئے اُس نے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جو ایک خانماں برباد حسین عورت اختیار کرسکتی ہے، وہ تماشہ گاہوں میں ناچتی تھی، ہوٹلوں میں جاجاکر گاتی تھی، سڑکوں پر، گلیوں میں اپنے پُرشباب اعضاء کی نمائش سے لوگوں کو لبھایا کرتی تھی۔ اسی زمانہ میں اس کے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور اس کے انجام سے ڈر کر اس نے اپنی آوارہ زندگی کو ترک کرکے ایک دوکان قایم کرلی جہاں وہ عورتوں کے کپڑے وغیرہ سیا کرتی تھی، رفتہ رفتہ لوگوں نے اس کے ماضی کو بھلا دیا اور طبقۂ امرا کی عورتیں بھی اس کی دوکان پر آنے جانے لگیں۔ اتفاق سے اسی دوران میں سلطنت کے ولی عہد (بوتی نیانوس نے) اس لڑکی کو دیکھ لیا اور اس پر مایل ہوگیا۔

ولی عہد کی نسبت کسی اور جگہ ہوچکی تھی اور اپنے مرتبہ کے لحاظ سے بھی وہ تیودورا سے شادی نہ کرسکتا تھا جس کا ماضی اس قدر بدنام تھا۔ لیکن ایک تو ولی عہد خود فطرتاً بہت آزاد واقع ہوا تھا، دوسرے اسی زمانہ میں جدید قانون کی رو سے شاہی خاندان کے افراد کو شادی کے مسئلہ میں پوری آزادی دیدی گئی تھی، اس لئے تخت نشین ہوتے ہی اس نے تیودورا سے نکاح کرلیا اور اسے بازنطینی سلطنت کا ملکہ بنادیا۔

کچھ عرصہ تک تو جاہ و ثروت، سلطنت و حکومت کے نشہ نے تیودورا کو مدہوش رکھا، لیکن جب وہ تھک گئی تو اس کو پھر اپنا وہی دورِ آزادی یاد آنے لگا اور تمام وہ جذباتِ جوانی جن کو واقعات نے افسردہ کردیا تھا، از سرِ نو تازہ ہوگئے، چنانچہ اُس نے اپنے تمام قدیم عشاق کو آہستہ آہستہ بلانا شروع کیا اور چند دن میں قصرِ حکومت اچھا خاصہ معصیت گاہ بن گیا۔

اُنھیں عشاق میں دو بھائی میکائیل کبیر و میکائیل صغیر بھی تھے، جو پوشیدہ طور پر ملکہ سے آکر ملا کرتے تھے، لیکن ایک کو دوسرے کی آمد کی اطلاع نہ ہوتی تھی۔ ایک دن چھوٹے میکائیل کو کسی طرح معلوم ہوگیا کہ ملکہ اس کے بڑے بھائی سے بھی ملتی ہے اور زیادہ التفات سے ملتی ہے۔ اس لئے وہ نہایت برہمی کے عالم میں ملکہ کے پاس گیا اور کہا کہ "اگر میرے بھائی کی آمد و رفت یہاں بند نہ کی گئی تو میں یہ تمام راز دُنیا پر افشاء کردوں گا۔"

یہ سُن کر ملکہ اس وقت تو خاموش ہوگئی لیکن اس نے فیصلہ کرلیا کہ کسی نہ کسی طرح اس کانٹے کو راستہ سے دور کرنا ہے۔

ملکہ اپنے مخصوص کمرہ میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی ہے کہ خادمہ جو اس کے تمام رازوں سے آگاہ ہے حاضر ہوتی ہے اور میکائیل کے آنے کی اطلاع دیتی ہے۔

ملکہ چونک کر پوچھتی ہے "بڑا؟" اور پھر ملکہ اس کے مسکراتے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر کہتی ہے :۔ "ہاں بلاؤ میں تو اس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔"

میکائیل آیا اور ملکہ کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر بولا کہ :۔ "جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اس وقت تک مچھلیاں اس کے جسم کو کھا چکی ہوں گی۔"

ملکہ نے گھبرا کر پوچھا "کیا واقعی تو نے اُسے قتل کر دیا۔"

میکائیل ۔ "ہاں قتل کر دیا اور دریا میں ڈال دیا۔"

"یہ سُن کر ملکہ نے اپنی آغوش کھول دی اور دونوں کے لب ایک دوسرے سے مل گئے اس حال میں کہ اُن کے جسم سے آگ کی سی حرارت پیدا ہو رہی تھی۔"

ٹھیک اس وقت جبکہ دونوں ریشم کے نرم نرم گدوں پر لیٹے ہوئے ہیجان نفس کی انتہائی کیفیات میں ڈوبے ہوئے تھے، ملکہ کی نگاہ میکائیل کی ہتیلی پر پڑی اور اُس نے خیال کیا کہ اس پر خون کا دھبہ ہے ۔ اس کے بعد اس نے میکائیل کی دوسری ہتیلی کو دیکھا، چہرہ کو دیکھا، گردن کو دیکھا اور ہر جگہ اُسے خون کے بڑے بڑے دھبے نظر آنے لگے۔

اس وقت تک تیودورا خدا معلوم کتنے جرائم کی مرتکب ہو چکی تھی، لیکن یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ اس کے ضمیر نے اس کے جرم کو اس طرح پیش کیا ہو۔ گزشتہ زندگی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ رہے تھے اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ کوئی آواز اس کو ملامت کر رہی ہے اور اس کا دل کانپا جا رہا ہے۔

کامل چھ ماہ گزر گئے ہیں کہ ہزاروں معمار باسفورس کے ساحل پر ایک عظیم الشان عمارت کی تکمیل میں رات دن مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ عمارت ملکہ تیودورا کے حکم سے تعمیر ہو رہی ہے جس میں ۵۰۰ آدمیوں کے قیام کا انتظام کیا گیا ہے۔ جس وقت یہ تعمیر مکمل ہو گئی تو ملکہ نے تمام ملک میں اعلان کیا کہ جو عورتیں گناہوں سے تائب ہو کر عصمت و عفت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں وہ آئیں اور اس عمارت میں قیام کریں۔ چنانچہ اس نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسی عورتیں اس مکان میں جمع کرنا شروع کیں اور کوشش کر کے اُن کی شادیاں شرفاء شہر اور امراء دربار سے کر دیں۔

اس عمارت کا نام اس نے "دارالتوبہ" رکھا تھا۔ اس کی نگرانی میکائیل کے سپرد تھی جو خود بھی تائب ہو کر پاک زندگی بسر کرنے لگا تھا۔

بادشاہ یوستی نیانوس، بازنطینی تخت حکومت پر ۵۲۷ء سے ۵۶۵ء تک متمکن رہا، لیکن اس ۳۸ سال کی مدت میں وہ اس راز سے بالکل ناواقف رہا کہ ملکہ نے دارالتوبہ کیوں قایم کیا تھا۔

خاص رعایت

ستان نمبر۔ علوم اسلامی نمبر۔ فرمانروایان اسلام نمبر
مبا نمبر۔ انشاء لطیف و نیاز نمبر۔ مومن نمبر۔ افسانہ نمبر
دگی قیمت علاوہ محصول ۳۱ روپیہ ہے لیکن یہ تمام نمبر
ساتھ طلب کرنے پر مع محصول ۲۶ روپیہ میں مل سکتے
بشرطیکہ قیمت پیشگی بھیجدی جائے۔

من و یزداں کامل ۔ مذہب ۔ فلسفۂ مذہب
کی مجموعی قیمت علاوہ محصول ۱۸ روپیہ ہے
لیکن ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول
۱۴ روپیہ میں مل سکتی ہیں۔ قیمت پیشگی
آنا ضروری ہے۔

جالستان ۔ نگارستان ۔ مکتوبات کامل۔
حسن کی عیاریاں ۔ شہاب کی سرگزشت۔
مجموعی قیمت علاوہ محصول ۲۶ روپیہ ہے لیکن ایک ساتھ
طلب کرنے پر مع محصول صرف ۲۳ روپیہ میں مل سکتی ہیں
قیمت پیشگی۔

(منیجر نگار۔ لکھنؤ)

چھوکرہ

بہترین اور نفیس کوالٹی ہے

ہماری خصوصیات

کپڑا
سلکی پلین

جورجٹ
بجرگ
کریپ
ساٹن
ٹفاٹہ
بشرٹ کلاتھ
شنٹون
مائلن
نینون

کپڑا
سلکی پرنٹس

فرنچ کوئین
چھوکرہ کوئین
ساٹن فلورنس
گولڈ کریپ
دل بہار
لنن
شنٹون

کپڑا
اونی

گیبرڈین
سوٹنگ
شال
سرج
پاناما
پرشیا

ان کے علاوہ نفیس سوتی چھینٹ اور اونی دھاگہ۔

تیار کردہ

دی امرتسر رین اینڈ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹڈ جی۔ٹی روڈ۔ امرتسر

ٹیلی فون 2562 تار کا پتہ:- "رین" "Rayon."

سٹاکسٹ = ٹراونکور رین لمیٹڈ۔ برائے سلکی دھاگا اور مومی (سیلوفین) کاغذ

باب الاستفسار

(۱)

وحید احمد خاں اور مولانا آزاد

قوم، امۃ، ملّت کا فرق اور دو قومی نظریہ

(محمد زکریا۔ آگرہ)

لاہور کے اخبار اقدام میں کچھ عرصہ سے ایک مسلسل تبصرہ وحید احمد خاں صاحب کا مولانا آزاد کی "انڈیا ونس فریڈم" پر شایع ہو رہا ہے۔ اس میں انھوں نے مولانا آزاد کے سیاسی رجحانات و دلایل پر جو اعتراضات کئے ہیں، مجھے ان سے بحث نہیں لیکن مضمون کی چھٹی قسط میں انھوں نے ایک ایسا اعتراض کر دیا ہے جس سے مجھے بھی یہ خلش پیدا ہو گئی ہے کہ کیا مولانا آزاد نے واقعتاً کوئی بات ایسی لکھ دی ہے جو تعلیم اسلام کے منافی ہے۔

وحید احمد خاں لکھتے ہیں :-

"مولانا ایک بلند پایہ عالم اور مفسر قرآن تھے اور احادیث و فقہ میں خود کو ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کا جانشین تصور کرتے تھے۔ بایں ہمہ علم و عرفان وہ اس حقیقت سے معلوم نہیں کیوں چشم پوشی کرتے تھے کہ اسلام کے قوانین اور اُس کا معاشی اور معاشرتی نظام کسی متضاد عقیدہ یا اُصول کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔"

(نگار) وحید احمد خاں صاحب، مولانا آزاد کی کتاب پر جس نقطۂ نظر سے گفتگو کر رہے ہیں وہ ممکن ہے آپ کے لئے نئی بات ہو، لیکن واقف الحال حضرات بخوبی آگاہ ہیں کہ خانصاحب موصوف تقسیم ہند سے پہلے بھی انتہا پسند مسلم لیگی تھے اور انھوں نے ایک ضخیم کتاب بھی مسلم لیگ کی پالیسی پر شایع کی تھی، جس میں انھوں نے دو قومی نظریہ پر زور دیتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کو ناقابل عمل و نامناسب ظاہر کیا تھا۔

جب تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان چلے گئے تو یہ موضوع ان کے لئے غیر دلچسپ سا ہو گیا کیونکہ ان کے حسب خواہش تقسیم ہند ہو چکی تھی اور جس مسلم حکومت کی انھیں تمنا تھی وہ قایم ہو گئی تھی۔

اس کے برسوں بعد جب مولانا آزاد کی کتاب شایع ہوئی تو ان کے سوئے ہوئے جذبات پھر بیدار ہوئے، اور اس طرح انھیں پھر ایک موقع پرانی داستان دُہرانے کا مل گیا۔

اقدام میری نگاہ سے گزرتا ہے، لیکن میں نے وحید احمد خاں صاحب کے اس مضمون کو کبھی توجہ سے نہیں پڑھا، کیونکہ دو قومی نظریہ کے پیش نظر تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے متعلق میں ان کے میلان و رجحان سے بخوبی واقف ہوں اور اس جانی بوجھی بات کو دوبارہ جاننے کی مجھے ضرورت نہ تھی، لیکن اب کہ آپ نے خاں صاحب کے ایک خاص فقرہ کا حوالہ دیا ہے جو اسلام کے اصول کے منافی ہے، ان کی غلط فہمی کو دور کرنا ضروری ہے۔

انھوں نے مولانا آزاد کے فضل و کمال پر جو طنز کیا ہے مجھے اس سے بحث نہیں لیکن ان کا یہ ارشاد کہ :۔ "اسلام کے قوانین اور ان کا معاشی و معاشرتی نظام کسی متضاد عقیدہ یا اصول کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا" قطعاً غلط ہے اور اسلام پر ایک بہتان عظیم !

میں آپ کے استفسار سے خوش ہوا کیونکہ اس سلسلہ میں مجھے قوم کے قرآنی مفہوم کی وضاحت کا بھی موقع مل گیا جو اصل میں ہے خاں صاحب موصوف کے دو قومی نظریہ کی۔

آیئے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ لفظ قوم کے علاوہ اور کون کون الفاظ قریب قریب اسی کے ہم معنی قرآن پاک میں استعمال ہوئے ہیں اور کس مفہوم میں۔

کلام مجید میں قوم کے علاوہ دو لفظ اور اسی قبیل کے ملتے ہیں :۔ ملت و اُمت ۔ قوم کا لفظ بکثرت استعمال کیا گیا ہے یعنی ۳۰۰ زیادہ مقامات پر ۔ امت کا اس سے کم قریب قریب ۵۰ جگہ ۔ ملت صرف ۱۸ بار ۔ اور جن جن مواقع پر ان کا استعمال ہوا ہے، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں الفاظ کا مفہوم ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہے۔

(۱) ـــ لفظ ملت کا مفہوم بہت محدود ہے یعنی وہ صرف شریعت، کیش، مذہب و مسلک کے معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ کلام مجید میں ۹ جگہ ملتِ ابراہیم مذہب ابراہیم ہی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے اور ایک جگہ سورۂ یوسف کی آیت :۔ "انی ترکت ملۃ قوم لا یومنون باللہ" سے یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ ملت اور قوم کا مفہوم ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

(۲) ـــ لفظ امت کا مفہوم بے شک ملت سے زیادہ وسیع ہے ۔ یہ لفظ عربی لغت میں محض ہنگام و مدت کے لئے بھی مستعمل ہے اور مقتدا کے لئے بھی اور دین و شریعت کے لئے بھی، لیکن قرآن مجید میں اس کا استعمال قوم کے وسیع مفہوم سے ہٹ کر محض ایک محدود جماعت کے لئے بھی ہوا ہے ۔ مثلاً :۔

۱ـــ "ومن قوم موسیٰ امۃ تہدون بالحق" (اعراف) (موسیٰ کی قوم میں ایک جماعت تھی جو حق کی ہدایت کرتی تھی)

۲ـــ "واذ قالت امۃ منہم لم تعظون قوما اللہ مہلکہم" (اعراف) (جب کہا ان میں سے ایک جماعت نے کہ کیوں تم ایسی قوم کو نصیحت کرتے ہو جسے اللہ ہلاک کرنے والا ہے)

ان دونوں آیتوں میں امت اور قوم دونوں کا استعمال جس طرح ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امت کا مفہوم بہ نسبت قوم کے محدود ہے اور ایک قوم مختلف امتوں میں منقسم ہو سکتی ہے۔

(۳) ـــ لفظ قوم جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا ہے، قرآن مجید میں سیکڑوں بار استعمال کیا گیا ہے اور مختلف صورتوں سے۔ کہیں اس کی توصیفی صورت ہے جیسے :۔

قوم یونس ۔ قوم کافرون ۔ فاسقون و ضالون وغیرہ۔

اور کہیں اضافی جیسے :۔

قوم نوح ۔ قوم موسیٰ ۔ قوم عاد ۔ قوم فرعون وغیرہ۔

پھر توصیفی استعمال تو ایسا نہیں جس سے ہم لفظ قوم کا کوئی مفہوم متعین کر سکیں ۔ لیکن اضافی استعمال سے البتہ تعیین مفہوم ہو سکتی ہے، کیونکہ اس طرح ہم کو یہ سوچنے کا موقع مل جاتا ہے کہ نوح و موسیٰ کے ساتھ قوموں کی نسبت کیوں کی گئی ۔ کیا اس لئے کہ وہ نوح و موسیٰ کے ہم خیال و ہم مذہب تھیں ۔ کیا اس لئے وہ ہم وطن تھیں ۔ پھر صورت اول تو یقیناً مقصود نہیں کیونکہ جن قوموں کی نوح و موسیٰ وغیرہ سے نسبت دی گئی ہے وہ ان کی منکر تھیں ۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اتحاد وطن ہی کی وجہ سے انھیں نوح و موسیٰ

سے منسوب کیا گیا ہوگا، اور اس طرح قرآن پاک سے قوم کا یہ مفہوم متعین ہوگیا کہ جو لوگ ایک ہی سرزمین یا ملک کے رہنے والے ہیں وہ سب ایک قوم میں شمار ہوں گے خواہ ان کا مذہب کچھ ہو۔

بنا بریں اگر ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ اس بنا پر کیا گیا تھا کہ ہندو مسلمان دو علحدہ علحدہ قومیں ہیں تو یہ قطعاً قرآنی مفہوم کے خلاف تھا، اور اب کہ ہندوستان و پاکستان ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں اور وہاں کے باشندوں کی نسبت وطنیت بدل گئی ہے ان دونوں ملکوں کی آبادی اپنی اپنی جگہ ایک ہی قوم سمجھی جائے گی۔ یعنی جس طرح ہندوستان کا مسلمان ہندوستانی قوم ہی کا ایک فرد سمجھا جائے گا اسی طرح پاکستان کا ہندو پاکستانی کہلائے گا۔

اب رہا وحید احمد خاں صاحب کا یہ ارشاد کہ :۔ "اسلام کسی متضاد عقیدہ رکھنے والی قوم کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔" سو اس کے متعلق مجھے ان تمام معاہدات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں جو رسول اللہ اور خلفاء راشدین نے غیر مسلم جماعتوں سے کئے تھے اور جن سے تاریخ اسلام کا ایک معمولی طالب علم بھی واقف ہے) بلکہ صرف دو معاہدوں کا ذکر کروں گا۔ جن سے پہلا ہجرت کے بعد کا وہ معاہدہ جو رسول اللہ نے مدینہ کے یہود سے کیا تھا اور جس میں اس کا اعتراف کیا گیا تھا کہ :۔ "انہم من امۃ واحدۃ" (دونوں ایک ہی امت کے ہیں[1])۔ دوسرا معاہدہ حدیبیہ کا جو کفار مکہ سے دب کر کیا گیا تھا میں نہیں سمجھتا کہ سمجھوتہ کرنے کی لچک اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

وحید احمد خاں صاحب کو سمجھنا چاہئے کہ وہ مذہب جو ساری دنیا کے لئے باعث رحمت ہونے کا مدعی ہے، اس کا نصب العین ہمیشہ صلح و آشتی ہی رہے گا اور وہ کبھی جنگ و خونریزی کا حامی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ تاریخ کا صحیح مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ رسول اللہ کبھی تلوار اٹھانے میں سبقت نہیں کی اور اسی وقت مقابلہ پر آئے جب وہ جان بچانے کے لئے مجبور ہو گئے۔

---

(۲)

گنڈہ — یا — غنڈہ

(سید الطاف حسین۔ لکھنؤ)

قومی آواز میں گنڈہ اور غنڈہ پر لوگ لکھ رہے ہیں۔ آپ کی رائے اس باب میں کیا ہے۔

اس میں شک نہیں آج کل سرکش، بدمعاش اور فسادی کو بعض اردو ادیب گنڈہ لکھتے ہیں اور بعض غنڈہ۔ لیکن اب سے چند سال قبل عام طور پر گنڈہ ہی استعمال ہوتا تھا۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ غنڈہ لکھنے کی ابتدا کب اور کیوں ہوئی؟

سب سے پہلے یہ غور کرنا چاہئے کہ گنڈہ اردو میں کس زبان سے لیا گیا ہے۔ پھر اگر گاف اور ڈال اس کے اصلی حروف ہیں اور بدل شدہ نہیں تو یہ لفظ عربی کا تو یقیناً نہیں ہو سکتا، کیونکہ عربی ان دونوں حرفوں سے خالی ہے۔ سنسکرت یا ہندی کا البتہ ہو سکتا ہے

---

[1] اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہم قوم ہونے کے لئے ہم مذہب ہونا ضروری نہیں بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ ایک ہی جگہ کے رہنے والے بھی اپنے آپ کو "ہم امت" کہہ سکتے ہیں۔

کیونکہ سنسکرت اور ہندی میں یہ دونوں حرف پائے جاتے ہیں۔ اور ان کا اجتماع بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر یہ لفظ سنسکرت سے نہیں لیا گیا، تو غالباً عربی سے لیا گیا ہوگا یا فارسی سے کیونکہ انھیں دونوں زبانوں کے بہت سے الفاظ اردو میں شامل ہیں۔

اگر یہ لفظ عربی سے لیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ غُنْدہ رہا ہوگا یا کُنْدہ (کیونکہ عربی میں گاف اور ڈال نہیں پایا جاتا) اور اگر فارسی سے لیا گیا ہے تو وہ گُنْدہ یا کُنْدہ رہا ہوگا۔

عربی میں غُنْدہ یا غُنْدَہ کوئی لفظ نہیں۔ غُنْدَر اور کُنْدَر ضرور ہیں جن کے معنی "موٹے تازے، تنومند، عیش پسند نوجوان" کے ہیں۔ اسی طرح کُنْد بہ معنی بخیل، عاصی، کافر نعمت مستعمل ہے اور کُنْدہ پہاڑ کے ایک حصہ کو کہتے ہیں۔

اب فارسی کو لیجئے :-

اس میں گُنْد، گُنْد، گُنْدہ، گَنْدہ، غُنْد اور غُنْدہ سب کا استعمال پایا جاتا ہے۔

ان کے معنی یہ ہیں :-

گُنْد ـــــ موٹا تازہ نوجوان۔

گُنْدہ ـــــ منکر و سرکش نوجوان۔ کوفتہ کباب۔

گَنْدہ ـــــ متعفن (چنانچہ گَنْداب یا گَنْدآب اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں خراب پانی جمع ہو)

غُنْد، غُنْدہ۔ ایک جگہ ڈھیر کی ہوئی کوئی چیز۔

چونکہ اُردو میں گُنْڈہ یا غُنْڈہ ایک قوی، شریر و بدمعاش شخص کو کہتے ہیں، اس لئے آیئے غور کریں کہ عربی و فارسی کے کن کن الفاظ سے یہ مفہوم اخذ ہوسکتا ہے۔

عربی میں غُنْدَر، کُنْدَر، گُنْد اور گُنْدہ چار لفظ ہیں ان میں غُنْدَر اور کُنْدَر کو تو چھوڑ دیجئے کیونکہ ان میں حرف رَا بھی پایا جاتا ہے لیکن گُنْد اور گُنْدہ کے مفہوم سے ضرور ایک بعید تعلق اُردو گُنْڈہ کا پایا جاتا ہے۔

اس طرح فارسی کے الفاظ غُنْد اور غُنْدہ کو بھی نظر انداز کر دیجئے کیونکہ ان کا مفہوم گُنْڈہ کے مفہوم سے مختلف ہے۔ البتہ گُنْد اور گُنْدہ کا مفہوم گُنْڈہ سے ملتا جلتا ہے۔

اس بیان سے یہ بات غالباً ایک حد تک صاف ہو جاتی ہے کہ گُنْڈہ کا معنوی تعلق عربی فارسی کے کسی ایسے لفظ سے نہیں جس میں غین اور ڈال کا اجتماع ہو۔ لیکن گاف اور ڈال یا کاف و ڈال رکھنے والے الفاظ میں ضرور گُنْڈہ کا مفہوم بڑی حد تک پایا جاتا ہے۔ کیونکہ جس طرح گُنْڈہ کے مفہوم میں قوت، فربہی، تنومندی کا مفہوم بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ (جیسا کہ گینڈا سے ظاہر ہے) اسی طرح گُنْد اور گُنْدہ کا بھی بنیادی مفہوم یہی ہے۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ گُنْڈہ، فارسی لفظ گُنْد یا گُنْدہ کی ہندی صورت ہے۔ اور غُنْڈہ کہنا درست نہیں۔ جو سنسکرت، فارسی، عربی یا اُردو کا لفظ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ان تمام زبانوں میں غ اور ڈال کا اجتماع نہیں ہوتا۔

پشتو میں بے شک غ اور ڈال کا اجتماع ایک لفظ میں ہو جاتا ہے، جیسے بلغنڈ بہ معنی بیل۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ہم گُنْڈہ کو فارسی لفظ گُنْدہ کی تبدیل شدہ صورت نہ سمجھیں جبکہ فرق صرف دال، ڈال کا ہے اور پشتو سے استناد کریں جس کے الفاظ کبھی اُردو میں رائج نہیں ہوئے ـــ ترکی و فارسی بولنے والی قوموں سے تو بے شک ہندوستان کا تعلق رہا ہے، لیکن بخیتونستان والوں سے نہیں، پشتو مقامی پراکرت ہے اور بہت محدود یہاں کہ وہ خود افغانستان کی بھی سرکاری زبان نہیں۔

اس لئے اُردو نے فارسی کا اثر تو بے شک بہت قبول کیا لیکن پشتو سے اس کے متاثر ہونے کی کوئی وجہ موجود نہ تھی۔

(۳)

مسئلہ رویت ہلال اور پاکستان

(ڈاکٹر بشیر احمد - انبالہ خورد - پاکستان)

قبلۂ محترم - سلام مسنون

عید کے موقع پر رویت ہلال کے بارے میں کم و بیش ۱۳ سال سے یہاں پر اختلاف چلا آتا ہے، اکثر سنجیدہ آدمیوں کو کہتے سُنا ہے کہ مسلمان عید جیسی اہم تقریب پر بھی ایک ہونے کا ثبوت نہیں دیتے، یعنی تمام مقامات پر عید ایک دن نہیں ہوتی - حالانکہ نہ شرعی لحاظ سے اور نہ جدید تحقیق کی رو سے ایسا کرنے میں کوئی قباحت ہے۔

عہد حاضر کے جدید فلکیاتی نظریات کے تحت چاند زمین کے گرد کم و بیش ۳۰ دن میں اپنی گردش پوری کرتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ غروب آفتاب کے بعد ایک ہی وقت میں چاند ہر جگہ نظر آئے۔ اس مرتبہ یہاں پاکستان بھر میں عید ایک ہی دن ۱۷ مارچ کو ہوئی، حالانکہ محکمہ موسمات کے علاوہ کراچی میں چاند دیکھنے کی کوئی عینی شہادت نہیں۔

رویت ہلال کے متعلق ایک حدیث نبوی بھی ہے :-

"قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تصوموا حتی ترؤوا الہلال ولا تفطروا حتی تروہ فان غم علیکم فاقدروا لہ وفی روایۃ قال الشہر ثلاثون لیلۃ فلا تصوموا حتی تروہ فان غم علیکم فاکملوا العدۃ ثلثین"

اس سلسلہ میں شرعی نقطۂ نگاہ اور فلکیاتی نظریہ کے تحت روشنی ڈال کر ممنون فرمادیں۔

نگار) مجھے معلوم ہے کہ حکومت پاکستان یہی چاہتی ہے کہ وہاں کے مسلمان ایک ہی دن روزہ رکھنا شروع کریں اور ایک ہی دن عید کی نماز پڑھیں اور اس سلسلہ میں وہاں کا محکمۂ موسمیات گردشِ قمر کا حساب لگا کر ایک خاص تاریخ اور دن کا اعلان کر دیتا ہے، لیکن وہاں کا مذہبی حلقہ اب تک رویت ہلال ہی کو ضروری سمجھتا ہے، چنانچہ امسال بھی کراچی میں محکمۂ موسمیات کے اعلان کے باوجود عید کی نماز دو دن ادا کی گئی (آپ یہ کیسے لکھتے ہیں کہ تمام پاکستان میں عید ۱۷ مارچ کو منائی گئی)۔

چونکہ ابتداء عہدِ اسلام میں اصل چیز سادگی تھی اور مذہب کو علمی پیچیدگیوں میں اُلجھانا مناسب نہ تھا، اس لئے اس مسئلہ میں بھی سادگی سے کام لے کر محض رویت ہلال کو اصل چیز قرار دیدیا گیا، اس سے مطلق بحث نہیں کی کہ گردشِ قمر و زمین کے حساب سے ۲۹ دن اور کچھ گھنٹے کب پورے ہوتے ہیں - بعد کو جب حکومت اسلام وسیع ہوئی اور مختلف ممالک دائرۂ اسلام میں آگئے تب بھی اس اصول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی (حالانکہ اگر وہ چاہتے تو فلکیاتی حساب سے رویت ہلال کی تاریخ متعین کیجا سکتی تھی)

آپ نے جو دو حدیثیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک حدیث میں "فاقدروا لہ" کے الفاظ ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر چاند نہ دیکھنے کی وجہ سے غفلت نہ آئے تو رویت ہلال کی تاریخ کا اندازہ کرلو، اور اس اندازہ میں فلکی حساب بھی شامل ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ دوسری حدیث میں صاف صاف یہ ہدایت درج ہے کہ اس صورت میں پورے ۳۰ دن شمار کرو، اس لئے اس حدیث کو پہلی حدیث کی تفسیر قرار دیا جائے گا اور فلکی حساب کا کوئی سوال باقی نہ رہے گا۔ ان حالات میں شرعی نقطۂ نظر سے صرف رویت ہلال پر بھروسہ کیا جائے گا یا پھر یہ کہ مہینہ پورے ۳۰ دن کا مانا جائے

اب رہا یہ سوال کہ اگر فلکی حساب سے کوئی تاریخ متعین کردی جائے (جو یقیناً صحیح ہوگی) تو اس کے تسلیم کرنے میں کیا قباحت

ہے جبکہ اس سے مسلمانوں کی عام اجتماعیت کا بھی مظاہرہ متصور ہے۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میں اس سے بالکل متفق ہوں لیکن اسی کے ساتھ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا مسلمانوں کے مظاہرۂ اتحاد و اجتماعیت کے لئے یہی مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اور اسی کو اولیت کا درجہ دینا چاہئے۔

کسی قوم کی اجتماعیت کا صحیح مفہوم اس کی جسمانی و مادی اجتماعیت نہیں بلکہ ذہنی، اخلاقی و عملی اجتماعیت ہے جس کو دوسرے الفاظ میں ہم مذہبی اجتماعیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے جب تک یہ روح اتحاد کسی جماعت میں پیدا نہ ہو، محض ظاہری شعائر کا اتحاد کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اگر تمام مذہبی تقریبات کا ایک خاص وقت و زمانہ متعین کر دیا جائے تو بھی بے نتیجہ سی بات ہے کیونکہ اصل چیز اخلاق کی درستی اور اسوۂ رسول و صحابہ کی پیروی ہے اور جب سرے سے اسی بنیادی چیز کا فقدان ہے تو رویت ہلال وغیرہ فروعی مسایل پر متحد ہو جانے سے کیا ہوتا ہے۔

اعتقادی مسایل میں حکومت مفاہمت و مشورہ کی صورت تو ضرور پیدا کر سکتی ہے لیکن کوئی قانون نہیں بنا سکتی۔ البتہ اگر کوئی حکومت عامۃ المسلمین کے حقیقی مفاد کے پیش نظر جبر و اکراہ سے کام لینا بھی ضروری سمجھتی ہے تو وہ ایسا کر سکتی ہے (جس کی مثال ہمیں مصطفےٰ کمال پاشا کے دور سیادت ترکی میں ملتی ہے) لیکن اس سلسلہ میں اسے سب سے پہلے اصولی باتوں کو لینا چاہئے اسلئے اگر پاکستان ضروری سمجھتا ہے کہ وہاں کے تمام مسلمان رویت ہلال کے باب میں اسی کے فیصلہ کی پابندی کریں اور ایک ہی مقررہ دن سے روزہ شروع کریں، ایک ہی متعین تاریخ میں عیدین کی نماز ادا کریں، تو کیا اس سے زیادہ مقدم یہ بات نہیں ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح اخلاق کے لئے سب سے پہلے وہاں قمار بازی، بادہ نوشی، عصمت فروشی، لہو و لعب، احتکار اور ربوا کے اداروں کو ختم کیا جائے جو اصل بنیاد ہیں تخریب اخلاق کی اور صحیح اسلامی اخلاق عوام میں اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب پہلے خواص اسے اختیار کریں ——— فہل من مدکر

ادارۂ فروغ اردو (نقوش) لاہور کے سالنامے

آپ ہم سے حاصل کر سکتے ہیں، آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ جو سالنامے مطلوب ہوں ان کی قیمت مع محصول بحساب ۵ فیصدی ہمیں بھیج دیجئے۔ پندرہ دن کے اندر آپ کو ذریعہ رجسٹری ملجائیں گی (وی۔پی کے ذریعہ سے نہیں بھیجے جا سکتے) منیجر نگار لکھنؤ

"نقوش" کا سالانہ چندہ :- ۲۵ روپیہ

طنز و مزاح نمبر ۱۰ر

پطرس نمبر ۸ر

ادب لطیف نمبر ۱۲ر

تاریخ ویدی لٹریچر

(نواب سید حکیم احمد)

یہ تاریخ اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب آریہ قوم نے اول اول یہاں قدم رکھا اور اُن کی تاریخی و مذہبی کتاب رگوید وجود میں آئی۔ یہ کتاب صرف ویدی ادب بلکہ اس سے پیدا ہونے والے دوسرے مذہبی و تاریخی لٹریچروں کے لحاظ سے بھی اتنی مکمل چیز ہے کہ اسکے مطالعہ کے بعد کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی اور اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو خالص موضوع پر اس قدر احتیاط و تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے۔ قیمت چار روپیہ

منیجر نگار لکھنؤ

امیر معاویہ کا دربار
اور
ایک بدوی جمال کا شاہانہ استغنا

(نیاز فتحپوری)

تاریخ عرب میں قبیلۂ بنی عذرہ کو اپنے شرفِ حسن و جمال اور امتیازِ عشق و محبت کی وجہ سے بڑی خصوصیت حاصل تھی۔ سرزمین نجد کے اس قبیلہ کی کسی لڑکی کا نام لے دینا گویا "جمال بارع" اور "محبت عفیف" کے کسی مجسمہ کا ذکر کر دینا تھا، یہاں تک کہ عربی زبان میں "الھوی العذری" (یعنی بنی عذرہ کی سی محبت) ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

ذیل کا واقعہ اسی قبیلہ کے "افسانہائے عشق و حسن" کا ایک ورق ہے جس کا ذکر ابن جوزی، نویری وغیرہ نے کیا ہے اور اس کے راویوں کا سلسلہ ہشام بن عروۃ تک پہونچتا ہے جو قرنِ اول کے مشہور محدث تھے۔ (نیاز)

امیر معاویہ میں دیگر امیرانہ خصوصیات کے ساتھ ایک خصوصیت ان کی معیشت و معاشرت کی نفاست و پاکیزگی بھی تھی اور سلام کی وہ سادگی جو عہد سعادت یا زمانۂ خلافت راشدہ میں پائی جاتی تھی، اس کا امیر معاویہ کی زندگی میں کوئی نشان نہیں ملتا۔ وہ امیر تھے، رئیس تھے، ایک خود مختار بادشاہ تھے اور ان کی امارت و سیادت میں انھیں اکاسرۂ عجم کی سی شان و شوکت پائی جاتی تھی جن کو مسلمانوں نے مغلوب کیا اور پھر خود ان سے مغلوب ہو گئے۔ عرب نے عجم کی زمین پر قبضہ کیا اور عجم نے عرب کے اخلاق پر۔ اس کی سب سے پہلی مثال امیر معاویہ کی ملوکیت تھی۔ وہاں حاجب و دربان بھی تھے، اور نقیب و چاؤش بھی، عجم کی درباریاں بھی تھیں اور انعام و اکرام کی بارش بھی، زریں کمر غلام بھی تھے اور نازک تن کنیزیں بھی۔

وہی ریگزار عرب جس کے عیش و نشاط کی ساری کائنات بقول فردوسی "شیر شتر خوردن و سوسمار" سے زیادہ نہ تھی، وہیں نصف صدی کے اندر اندر ہر امیر عرب کا گھر فردوس نظر آتا تھا اور دنیا کی تمام وہ عشرتیں جو دولت و حکومت سے حاصل کی جا سکتی ہیں ان کو تھیں، چنانچہ امیر معاویہ کے دسترخوان کی وسعت، مختلف قسم کے لذیذ کھانوں کی اختراع اور کھانے کے وقت نغمہ و موسیقی، لطایف و ظرایف کی صحبتیں تاریخ عرب کے بڑے روشن واقعات ہیں۔[1]

---

[1] امیر معاویہ کے بہت سے "لطایف مایدہ" تاریخ میں محفوظ ہیں۔ انھیں میں سے ایک وہ بھی نہایت لطیف واقعہ ہے جو جناب حسین کے ساتھ ہوا۔ ایک بار حسین بھی مدعو تھے اور دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ جناب حسین نے مرغ مسلم لے کر اس کا گوشت جدا کرنا چاہا۔ امیر معاویہ نے مزاحاً کہا: "ہبینک وبینھا عداوۃ" (کیا آپ کے اور اس مرغی کے درمیان کچھ عداوت ہے)۔ جناب حسین نے برجستہ فرمایا "وھل بینک وبین ابنھا قرابۃ" (تمھارے اور اس کے بیٹے کے درمیان کچھ قرابت ہے)۔

معاویہ کا دسترخوان پوری وسعت کے ساتھ بچھا ہوا ہے اور ہر شخص کو شرکت کی اجازت ہے۔ ہجوم آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے اور کھانا شروع کرنے کی اجازت ہونے ہی والی ہے کہ قبیلۂ بنی عذرہ کا ایک خوشرو نوجوان جس کے چہرہ سے شرافت، غمگینی اور جذبات حزیں ظاہر ہو رہے تھے، اُٹھا اور اس نے معاویہ کو مخاطب کر کے کہا:۔

معاوی، یا ذا الفضل والحلم والعقل ... وذا البر والاحسان والجود والبذل
اتیتک لما ضاق فی الارض مسکنی ... وانکرت مما قد اصبت بہ عقلی
فرج۔ کلاک اللہ۔ عنی فانی ... لقیت الذی لم یلقہ احد قبلی،
وخذلی۔ ہداک اللہ حقی من الذی ... دمانی بسہم کان اھون ما قتلی
وکنت ارجو عدلہ ان اتیتہ ... فاکثر تردادی مع الحجب والکبل
سبانی "سعدیٰ" وانبری لخصومتی ... وجار ولم یعدل وغاضبنی اھلی
فطلقتھا من جہد ما قد اصابنی ... فھذا امیر المومنین من العدل

اس کا خلاصۂ مفہوم یہ ہوا کہ "اے صاحب فضل وکرم معاویہ، میں آپ کے پاس اس حال میں آیا ہوں کہ خدا کی زمین باوجود وسیع ہونے کے مجھ پر تنگ ہو چکی ہے، اس لئے میری فریاد کو پہونچئے اور میرا حق اس سے دلوائیے جس نے مجھے ان تیروں سے زخمی کیا ہے جن سے زیادہ آسان میرے لئے قتل کیا جانا تھا۔ میں اس سے عدل وانصاف کی توقع رکھتا تھا، لیکن اس نے مجھ پر قید وبند کی مصیبت ڈالدی اور میری محبوبہ سعدیٰ کو مجھ سے چھین لیا۔ اے امیر المومنین آپ ہی بتائیے یہ کہاں کا عدل وانصاف ہے؟

امیر معاویہ نے اس نوجوان کی یہ دردناک اشعار سنے اور کہا کہ وہ اپنی سرگزشت زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرے۔ اس نے کہا کہ:۔

"اے امیر المومنین آپ کی عمر دراز ہو، میں قبیلۂ بنی عذرہ کا ایک حقیر فرد ہوں اور میری داستان بڑی دردناک ہے۔ کچھ زمانہ ہوا جب میری شادی میری بنت عم (چچا کی لڑکی) سے ہوئی اور میں نے اس کی محبت میں، جو کچھ میرے پاس تھا اپنے چچا کی نذر کر دیا۔ جب میرے چچا نے دیکھا کہ میرے پاس سوا محبت کے اور کچھ نہیں رہا تو اس نے بے التفاتی شروع کی اور اپنی بیٹی سعدیٰ کو مجھ سے کہا کہ مجھ سے علیحدہ ہو جائے۔ ہر چند یہ بات اس پر نہایت شاق تھی لیکن اس غیرت وحیا کی وجہ سے جو قبیلۂ بنی عذرہ کی خصوصیت ہے، وہ اپنے باپ کے فرمان کی مخالفت نہ کر سکی اور اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔

میں نے پہلے تو کوشش کی کہ کسی طرح اس غم کے بار کو برداشت کر سکوں، لیکن جب کام صبر وضبط سے باہر ہو گیا تو میں آپ کے عامل مروان بن الحکم کے پاس گیا اور اس کو اپنی داستان دردناک سنا کر مداوا چاہا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ اس ظلم کی تلافی کر دے گا جو مجھ پر سعدیٰ کے باپ کی طرف سے توڑا گیا تھا، لیکن میرا یہ خیال بالکل غلط نکلا، کیونکہ جب اس نے میرے چچا اور میری بیوی کو بلا کر حال کیا تو وہ خود اس کے حسن کا فریفتہ ہو گیا اور دس ہزار درہم میرے چچا کو دے کر سعدیٰ کے نکاح کا پیام دے دیا، میرا چچا جو بہت زیادہ طماع ہے راضی ہو گیا اور مروان بن الحکم نے مجھے بلا کر زندان میں ڈال دیا اور مجبور کیا کہ میں سعدیٰ کو طلاق دے دوں، میں نے اول اول تو انکار کیا، لیکن جب میں نے دیکھا کہ اگر میں طلاق نہ بھی دوں گا تو وہ کسی نہ کسی طرح اس پر قابض ہو جائیگا اور اُدھر قید کی سختیاں بھی ناقابل برداشت حد تک پہونچ گئی تھیں اس لئے میں نے حد درجہ مجبور ہو کر اس کو طلاق دے دی اور اب اے امیر المومنین آپ کے دربار میں آیا ہوں کہ میرے اس درد کا مداوا کیجئے۔"

یہ کہکر وہ نوجوان بے اختیارانہ طور پر رونے لگا اور یہ شعر برجستہ پڑھے:۔

فی القلب منی نار — والنار فیہا استعار
والعین تبکی بشجو، — فدمعہا مدرار
والحب داء عسیر، — فیہ الطبیب یحار
حملت منہ عظیما — فما علیہ اصطبار
فلیس لیلی لیل — ولا نہاری نہار

یعنی میرے دل میں وہ آگ بھڑک رہی ہے جس کا کوئی آگ مقابلہ نہیں کرسکتی اور میری آنکھوں سے جو طوفان اشک جاری ہے اس کا کوئی طوفان مقابلہ نہیں کرسکتا۔ سچ ہے محبت ایسی سخت بیماری ہے جس کا علاج کسی طبیب کے بس کی بات نہیں اور اب میرا حال صبر وضبط کی حد سے اس طرح گزر گیا ہے کہ اب میری زندگی میں نہ دن کا کوئی مفہوم رہ گیا ہے نہ رات کا۔

یہ سُن کر امیر معاویہ بہت متاثر ہوئے اور اسی وقت ابن الحکم کے نام ایک خط تحریر کرایا جس میں یہ اشعار بھی تھے:۔

رکبت امرا عظیما لست اعرفہ — استغفر اللہ من جور امرء زانی
قد کنت تشبہ صوفیا لہ کتب — من الفرایض او آیات فرقان
حتی اتانا الفتی العذری منتحباء — یشکو الی بحق غیر بہتان
ان انت راجعتنی فیما کتبت بہ — لاجعلنک لما بین عقبان

یعنی تم نے نہایت سخت جرم کا ارتکاب کیا جس کا علم مجھے ایک لڑکی بنی عذرہ کی فریاد سے ہوا، بہرحال اگر تم نے حکم کی تعمیل نہ کی تو سخت سزا دی جائے گی۔

امیر معاویہ نے کمیت اور نصر بن ذبیان کو متعین کیا کہ ابن الحکم کے پاس یہ فرمان لے جادیں اور جلد سے جلد پہونچنے کی ہدایت کی اس وقت یہ فرمان ابن الحکم کے پاس پہونچا تو اس نے پڑھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا "کاش امیر المومنین ایک سال تک اور مجھے اسی حال میں چھوڑ دیتے اور پھر اگر تلوار سے میری گردن بھی مار دیتے تو مجھے عذر نہ ہوتا"

الغرض نہایت جبر و اکراہ کے ساتھ اس نے سعدیٰ کو طلاق دی اور پیغامبروں کے ساتھ اسے کر دیا۔ جس وقت ان لوگوں نے لکی صورت دیکھی تو مبہوت ہوگئے کیونکہ انھوں نے بھی آج تک ایسا حُسن ساحر نہ دیکھا تھا۔ ابن الحکم نے فرمان معاویہ کے جواب میں، جو شعر ھے وہ یہ تھے:۔

اعذر فانک لو ابصرتہا — منک الامانی علی تمثال انسان
وسوف تاتیک شمس لیس یعدلہا — عند البریۃ من انس ومن جان
حوداء یقصر عنہا الوصف ان وصفت — اقول ذلک فی سر واعلان

(یعنی میں نے اگر یہ حرکت کی تو معذور تھا کیونکہ اگر آپ اسے دیکھتے تو آپ کا بھی وہی حال ہوتا۔ بہرحال وہ آفتاب حُسن عنقریب آپ کے پاس پہونچنے والا ہے جس کا نظیر روئے زمین پر نہیں مل سکتا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اگر اس کو حور سے تشبیہ دی جائے تو بھی حقیقتاً اس کی توہین ہے)

امیر معاویہ نے ابن الحکم کی تحریر پڑھ کر کہا کہ میں اس کی تعمیل حکم سے میں خوش ہوا لیکن سعدیٰ کی تعریف میں اس نے معلوم ہوتا ہے

زیادہ مبالغہ سے کام لیا ہے۔ معلوم نہیں نغمہ و موسیقی اور شعر و ادب کا بھی کچھ ذوق رکھتی ہے یا نہیں۔ یہ کہکر امیر معاویہ نے اس کے بلانے کا حکم دیا اور جس وقت وہ سامنے آئی تو سارے بدن میں اک لرزش سی پیدا ہوگئی اور اسی وقت انھوں نے طے کرلیا کہ اس نوجوان کو دولت اور کنیزیں وغیرہ دے کر راضی کرلینا چاہئے اور سعدیؒ کو اپنے لئے مخصوص۔

یہ سوچ کر امیر معاویہ نے اس نوجوان کو طلب کیا اور پوچھا کہ "اے نوجوان، کیا کوئی صورت ہوسکتی ہے کہ تو سعدیؒ کا خیال چھوڑ دے"

نوجوان ـــــ "ہاں، ایک صورت ہے"

امیر معاویہ ـــــ "کیا؟"

نوجوان ـــــ "یہ کہ میرا سر میرے تن سے جدا کر دیا جائے"

امیر معاویہ ـــــ "میں سعدیؒ کے عوض تجھے تین نہایت حسین دوشیزہ لونڈیاں دیتا ہوں اس حال میں کہ ہر لونڈی ہزار ہزار دینار کی ہے علاوہ اسکے بیت المال سے تیرے لئے اتنی رقم مقرر کردونگا کہ تو نہایت امن و سکون سے ان کنیزوں کے ساتھ زندگی بسر کرسکے"

امیر معاویہ ابھی اپنے انعام و اکرام کی فہرست پوری طرح پڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ نوجوان چیخ مار کر فرش پر گرا اور ہر شخص نے گمان کیا کہ شاید وہ مرگیا ہے، جب وہ ہوش میں آیا تو امیر معاویہ نے دریافت کیا:۔

"اے اعرابی کیا حال ہے"

نوجوان ـــــ "اس شخص کا حال آپ کیا پوچھتے ہیں جس کی مایوسی اس حد تک پہونچ چکی ہو، میں سمجھتا تھا کہ ابن الحکم کی چارہ جوئی آپ سے کروں گا، لیکن جب آپ بھی یہ فرمائیں تو بتائیے اب کہاں جاؤں"

لا تجھلنی والامثال تضرب بی ۔۔۔ کالمستغیث من الرمضاء بالنار

اردو سعاد علی حیران مکتئب ۔۔۔ یمسی ویصبح فی ہم و تذکار

قد شفہ قلق ما مثلہ قلق ۔۔۔ واسعر القلب منہ ای اسعار

کیف السلو وقد ہام الفواد بہا ۔۔۔ واصبح القلب عنہا غیر صبار

"یعنی اے امیر المومنین اپنے طرز عمل سے میرا حال اس شخص کا سا نہ کیجئے جو گرمی سے بھاگ کر آگ کی پناہ ڈھونڈھنے نکلے میری محبوبہ کو مجھ حیران و مغموم کے سپرد کر دیجئے کیونکہ اس کے درد مفارقت نے مجھ کو زار و نزار بنا دیا ہے اور اب قلب میں صبر کی طاقت باقی نہیں رہی"

یہ سن کر امیر معاویہ کو غصہ آیا اور بولے "اے اعرابی تو اقرار کرتا ہے کہ تو نے سعدیؒ کو طلاق دیدی تھی۔ مروان بھی اس کا شاہد ہے، اس لئے وہ تیرے سپرد کیونکر کی جاسکتی ہے جب تک کہ پھر تیرے ساتھ نکاح نہ ہو، اس لئے اس سے دریافت کرنا ضروری ہے کہ وہ تیرے ساتھ نکاح پر راضی ہے یا کسی اور شخص کے ساتھ" یہ کہکر امیر معاویہ نے ایک مخفی اشارہ سعدیؒ کی طرف کیا جس سے مقصود اپنے آپ کو پیش کرنا تھا اور دریافت کیا کہ "اے سعدیؒ، تو کس کو پسند کرتی ہے، امیر المومنین کو جو صاحب عز و شرف ہے، یا ایک اعرابی کو جو مفلس و محتاج ہے" سعدیؒ نے اعرابی کی طرف اشارہ کرکے کہا:۔

ہذا، وان کان فی فقر و اضراد ۔۔۔ وکان فی نقص من ایسار

اکثر عندی من ابی و جاری ۔۔۔ وصاحب الدرہم و دینار

"یعنی مجھے، تو یہ اعرابی چاہئے جس کا فقر و افلاس مجھے ساری دنیا کی دولت سے زیادہ عزیز ہے"

ایک سرزمین جہاں شوہر فروخت ہوتا ہے

یاز فتحپوری)

ایک امریکی خاتون جین ڈولنگر نے حال ہی میں امریکہ کے ایک ریڈ انڈین علاقہ میں چار مہینہ قیام کرکے وہاں کی ایک قوم کشبو
حالات زندگی اور ان کی رسم کتخدائی کا ذکر کیا ہے، جو بہت دلچسپ اور عجیب و غریب ہے، بلٹز کے حوالہ سے اس کا اقتباس ملاحظہ ہو

یہ قوم دریائے امیزن کے کنارے ایک ایسے دور افتادہ مقام میں پائی جاتی ہے، جہاں تہذیب جدید اب تک نہیں پہونچ سکی اور
وحشت کی بہت سی یادگار رسمیں ان میں پائی جاتی ہیں۔

اس قوم کا نظام بالکل عورتوں کے ہاتھ میں ہے اور مرد کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں، یہاں تک کہ عورتیں اسے دوسرے
س کی طرح رہن و فروخت بھی کر سکتی ہیں اور وہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ان کی سردار بھی ایک عورت ہی ہے جو سیاہ و سپید کی مالک ہے،
ئی اس کے حکم کے خلاف سرتابی نہیں کر سکتا۔ خاتون موصوف لکھتی ہیں کہ مجھے یہاں قیام کئے ہوئے صرف چار مہینے ہوئے تھے لیکن
سی قلیل زمانہ میں یہاں کی عورتوں میں گھل مل کر کشبو قبیلہ ہی کا ایک فرد سمجھی جاتی تھی۔ اس وقت تک یہاں کی سردار خاتون نے جس کا
لا تھا مجھے کبھی اُس مجلس مشورہ میں شریک ہونے کا موقع نہیں دیا تھا جو ہر ہفتہ یہاں ہوا کرتی ہے۔

ایک دن صبح کو جبکہ حسب معمول کھجور کے پتوں کے جھونپڑے کے فرش پر مجھ عورتیں حلقہ بنائے ہوئے بیٹھی تھیں اور کٹلا
ے گفتگو کر رہی تھی، خلاف امید مجھے بھی اس کونسل میں شرکت کی دعوت دی گئی۔

دوران گفتگو میں دفعتاً کٹلا نے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:۔ "تم کو یہاں آئے ہوئے کافی زمانہ گزر گیا ہے، تم نے ہمارے
مل کر کھیتوں میں کام کیا ہے، جنگلوں میں جاکر پھل چنے ہیں، اور بہت سے کاموں میں ہمارا ہاتھ بٹایا ہے، لیکن تم نے اب تک کوئی
پسند نہیں کیا جس سے ہماری آبادی میں اضافہ ہوتا، لیکن اب ضروری ہے کہ تمھارا شوہر انتخاب کیا جائے اور اس کا میں نے
م کر دیا ہے"۔

یہ سن کر میں عرق عرق ہوگئی کیونکہ وہ وقت جس سے میں ڈر رہی تھی آخر کار آ ہی گیا، اس نے میرے جواب کے انتظار کئے بغیر سلسلہ
اری رکھتے ہوئے کہا کہ "آج رات تم کمال گیری سے شادی کروگی" اور اُنگلی سے ایک جھونپڑے کی طرف اشارہ کرکے جو میرے جھونپڑے
ب تھا کہا کہ "اس کی مچھر دانی تم اسی جھونپڑے میں پاؤگی"۔

یہاں کا قانون ہے کہ جب کوئی کسی مرد کی مچھر دانی اپنے جھونپڑے میں لے آتی ہے تو وہ اس کا شوہر ہو جاتا ہے، خواہ وہ اسے پسند کرے
، بصورت انکار اسے قبیلہ سے خارج البلد کر دیا جاتا ہے، لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے کیونکہ کشبو قوم کی عورتیں عموماً خوبصورت ہوتی ہیں
اپنے متعلق یہ فیصلہ سن کر میں دنگ رہ گئی، لیکن کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ کٹلا کا فیصلہ یہاں خدائی فیصلہ تھا اور اسکی مخالفت
ت خطرہ مول لینا تھا۔ میں کمال گیری سے واقف تھی اس کی عمر ۲۵ سال کی تھی اور گاؤں کا سب سے زیادہ حسین و قوی مرد
جاتا تھا۔ ہر چند وہ بہت کم گو اور الگ تھلگ رہنے والا نوجوان تھا لیکن گاؤں کی تمام عورتیں اس کے سڈول و خوبصورت جسم
دیتی تھیں چنانچہ میرے چار ماہ کے قیام میں کم از کم بارہ عورتیں اسے اپنا شوہر بنا چکی تھیں۔ لیکن اس شیفتگی کا تعلق محض حسن سے

نہیں تھا بلکہ زیادہ تر اس بات سے کہ وہ بہت محنتی و جفاکش تھا اور جب تک وہ کسی کا شوہر رہتا تھا دونوں کی زندگی بڑے آرام سے گزرتی تھی، وہ مچھلی، گھڑیال، بندر، ہرن وغیرہ شکار کرکے لاتا رہتا اور نہایت عیش و فراغت کے ساتھ پورا خاندان اپنی زندگی بسر کرتا۔

یہاں کی عورتیں اپنے شوہروں کی مالک ہیں اور آپس میں ان کا تبادلہ بھی کرتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ اچھے شوہر کے بدلے اپنے دو دو شوہر دیدیتی ہیں اور کبھی کبھی برتن اور کپڑے بھی ساتھ کر دیتی ہیں۔

یہاں کم عورتیں ایسی ہیں جو صرف ایک شوہر پر قناعت کریں، وہ بیک وقت کئی شوہروں کی مالک ہوتی ہیں۔ ان میں ایک عورت اہانا تو ایسی تھی جو بیک وقت پانچ پانچ شوہر رکھتی تھی اور ہمیشہ انھیں بدلتی رہتی تھی۔

یہاں کی اکثر لڑکیاں گیارہ تیرہ سال کی عمر کے درمیان اپنا شوہر چن لیتی ہیں اور تقریباً ہر سال ایک بچہ کی ماں بن جاتی ہیں یہاں وہی عورت زیادہ اچھی سمجھی جاتی ہے جس کے بہت سے بچے ہوں اور جو بڑے خاندان کی مالک ہو۔ یہاں کے مرد عورتوں کے اس اقتدار سے خوش نہیں ہیں بلکہ اس کو اچھا سمجھتے ہیں۔ وہ صبح ہوتے ہی کشتیوں میں بیٹھ کر شکار کو نکل جاتے ہیں اور سہ پہر کو جب واپس آتے ہیں تو ان میں سے بعض یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی مچھر دانیاں غائب ہیں، اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ان کی شوہریت کہیں اور منتقل کر دی گئی ہے، چنانچہ وہ سارے گاؤں میں ڈھونڈھتے پھرتے ہیں کہ ان کی مچھر دانیاں کس عورت کے جھوپڑے میں ہیں اور وہ اسی کے شوہر ہو جاتے ہیں۔

جس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ آج رات کو کمال کیری کی مچھر دانی مجھے اپنے جھوپڑے میں ملے گی اور اس طرح وہ میرا شوہر بن جائے گا تو میں بڑی فکر میں مبتلا ہو گئی اور دن بھر سوچتی رہی کہ اس عذاب سے نکلنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

سہ پہر کو میں دوسری عورتوں کے ساتھ کیلے چننے کے لئے جنگل جا رہی تھی کہ اہانا بھی میرے ساتھ ہو گئی۔ یہ عرصہ سے خواہشمند تھی کہ کسی طرح کمال کیری کو اپنا شوہر بنائے، لیکن وہ اس کی بیویوں سے سودا کرنے میں کامیاب نہ ہوئی تھی، اب چونکہ وہ میری ملکیت میں آ گیا تھا، اس لئے اس نے مجھ سے گفتگو کی اور بولی کہ اگر تم راضی ہو جاؤ تو میں اس کے عوض تم کو پانچ شوہر دینے کو آمادہ ہوں بلکہ ساتھ ہی بہت سے مچھلی کے کانٹے اور کپڑے بھی دوں گی۔"

میں یہ سن کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی اور آخر کار میرے اس کے درمیان ایک بات طے ہو گئی اور جو تدبیر میں سوچ رہی تھی اس پر وہ بڑی خوشی سے اسنے منظور کر لی۔

جب غروب آفتاب سے قبل مرد شکار سے واپس آئے تو حسب معمول انھیں ڈھونڈھنا پڑا کہ ان کی مچھر دانیاں کہاں ہیں اور وہ کس عورت کی ملکیت میں منتقل ہو گئے ہیں لیکن کمال کیری کو اپنی مچھر دانی میرے ہی جھوپڑے میں ملی، اور وہ وہیں پڑ رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب سونے کا وقت آئے گا تو حسب دستور میں بھی اس کی مچھر دانی میں جا کر سو رہوں گی۔ لیکن جیسا کہ پہلے سے طے ہو گیا تھا میرے بجائے اہانا چلی گئی اور صبح کو اس کی مچھر دانی میں نے اپنے جھوپڑے سے نکال کر باہر پھینک دی اور وہ مسکراتا ہوا اپنی مچھر دانی لے کر چلتا ہوا۔

یہ راز میرے اور اہانا کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا، لیکن اب کمال کیری بھی اس سے واقف ہو گیا اور وہ اس پر خوش تھا، کیونکہ اس کی خواہش بھی عرصہ سے یہی تھی کہ وہ اہانا کا شوہر بن سکے، لیکن اس کی کوئی بیوی اس کے تبادلہ پر راضی نہ ہوتی تھی۔

اس کے بعد چند دن تک کٹلا بھی مجھے مشتبہ نگاہوں سے دیکھتی رہی، لیکن اصل راز کا علم اسے نہ ہو سکا۔

لکھنؤ کے افیونی

(شوکت تھانوی)

افیون تو ایک ایسی چیز ہے جس کو اپنے اثرات کے اعتبار سے ایک بنگالی اور ایک بھوٹانی، ایک پنجابی اور ایک آسامی کے لئے یکساں ہونا چاہئے لیکن اس سلسلہ میں لکھنؤ نے جو شہرت حاصل کی ہے وہ شاید دُنیا کے کسی حصّہ کو نصیب نہیں ہوئی، بظاہر خصوصیت عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن وہ لوگ جو افیونیوں کو بھی دیکھ چکے ہیں اور اہل لکھنؤ سے بھی ملے ہیں، اس خصوصیت کی وجہ جانتے ہوں گے کہ "لکھنویت" اور "افیونیت" دونوں اس حد تک متصل ہیں کہ ایک اجنبی کو ایک پر دوسرے کا شبہ ہو سکتا ہے۔ افیونیوں میں خواہ وہ دُنیا کے کسی حصّہ کے رہنے والے ہوں قدرتی طور پر بہت سی ادائیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو اہل لکھنؤ کے لئے مخصوص ہیں اور لکھنؤ کے اس باشندے میں بھی افیون کی سی شان ہوتی ہے، جس بیچارے نے کبھی افیون کی صورت بھی نہ دیکھی ہو خدا جانے اس مماثلت کی کیا وجہ ہے، لیکن آپ کو چاہئے کہ ہمارے بیان کی تصدیق کرنے کے لئے کسی ایسے لکھنوی سے ملئے جو افیونی نہ ہو اور پھر اس کا مطالعہ اس نظر سے کیجئے کہ اس میں "افیونیت" ہے یا نہیں تو آپ کو ہمارے بیان کی تائید کرنا پڑے گی، اسی طرح آپ کسی افریقی افیونی کو دیکھئے تو وہ باوجود اپنی ملکی وحشت کے آپ کو اپنی خاص کیفیت میں بہت بڑی حد تک لکھنوی نظر آئے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افیون کے استعمال کے بعد انسان اس حد تک شائستہ ہو جاتا ہے کہ اس پر لکھنوی ہونے کا شبہ کیا جائے ورنہ اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ اہل لکھنؤ نے شائستگی افیونیوں سے لی ہے، بہرحال جو کچھ بھی ہو یہ کچھ "حساب دوستاں در دل" والا قصہ معلوم ہوتا ہے۔

لکھنؤ کے افیونیوں کے متعلق ہم نے اسقدر روایتیں سنی تھیں کہ آخر ہم کو کسی لکھنوی افیونی سے ملنے کا شوق پیدا ہوا لیکن جب اس شوق کی تکمیل نہ ہوئی تو اس نے رفتہ رفتہ آرزو کی صورت اختیار کر لی، ہمارا یہ شوق غالباً بیجا بھی نہ تھا، ذرا تصور تو فرمائیے کہ ایک تو افیونی اور پھر لکھنوی یہ دونوں خصوصیات اپنی اپنی جگہ پر تاریخی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن جب وہ ایک ہی ہستی میں جمع ہو جائیں تو وہ کیا قیامت ہو گی ؟ ــــ کریلا اور نیم چڑھا ــــ مختصر یہ کہ ہم خدا کی اس عجیب و غریب صنعت کو دیکھنے کے لئے بیچین تھے، لیکن اب نہ تو وہ لکھنؤ رہ گیا ہے اور نہ اس کی وہ روایتی خصوصیات باقی ہیں، لیکن خداوند کریم تو بڑا مسبب الاسباب ہے اس نے ہماری جستجو کو ناکام نہ رہنے دیا اور ہم کو بہت جلد میر صاحب سے شرف نیاز حاصل ہو گیا۔

میر صاحب اپنے کو شاہی خاندان سے متعلق بتاتے تھے اور اس کا ثبوت پندرہ روپیہ ماہوار کا وثیقہ تھا جو ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو بغیر کسی دقت کے برابر مل رہا تھا آپ نہ صرف خالص لکھنوی تھے بلکہ نجیب الطرفین افیونی بھی تھے اور اپنی جماعت میں اس خصوصیت کے اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے گھر کے اکیلے تھے بیوی بچے تو خیر ایک سرے سے تھے ہی نہیں لیکن ان کے علاوہ نزدیک یا دور کے کسی عزیز کا پتہ نہ چلتا تھا ان کو بیوی بچوں اور عزیزوں کا لطف اپنی افیون ہی سے حاصل تھا اور وہ اپنے کو افیون کے لئے مٹائے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً پچاس بلکہ اس سے بھی کم ہو گی لیکن افیون نے ان کو قبل از وقت پٹاری کا انگور بنا دیا تھا اس کے علاوہ ان کی عام صحت کا یہ حال تھا کہ اگر وہ افیون کے عادی نہ ہوتے

تو ان کی موت یقیناً تپ دق سے واقع ہوتی مگر اب بھی وہ غریب کھانسی، دمہ اور قبض وغیرہ سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ توانائی کا یہ حال تھا کہ اگر میڈیکل کالج کے طلباء ان کو دیکھ پاتے تو اس زندہ انسانی ڈھانچے کو کبھی نہ چھوڑتے اور اپنے کالج کے میوزیم میں مطالعہ کرنے کے لئے یقیناً بند کر دیتے۔ شکل وصورت کا تو ذکر ہی کیا ضعیفی میں انسان خوبصورت تو نہیں البتہ خوبصورتوں کو ہنسانے والی ایک چیز بن جاتا ہے۔ لیکن میر صاحب پر تو معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بڑھاپا پھٹ پڑا ہے کمر بھی اونگتے اونگتے جھک گئی تھی۔ تمام جسم کی کھال لٹک پڑی تھی، چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں، سر کے اُلجھے ہوئے پٹے بھی اُلجھے ہوئے تھے، اور کھچڑی داڑھی بھی آزادی کے ساتھ جدھر چاہتی تھی پھیل رہی تھی، حد تو یہ ہے کہ اُنگلیوں کے ناخن بھی قطع وبرید سے بالکل آزاد تھے۔ لباس کے معاملہ میں وہ بہت سادہ مزاج واقع ہوئے تھے یہ غور کرنے کی بات ہے کہ خاندان شاہی کا یہ چراغ نہایت سادہ وضع میں زندگی بسر کر رہا تھا، اُن کے گھر میں کپڑوں کے لئے کوئی بکس کوئی صندوق یا کوئی صندوقچی نہ تھی اور نہ اس کی کوئی ضرورت تھی میر صاحب کے پاس جس قدر کپڑے تھے وہ سب ان کے جسم پر رہتے تھے ہم نے تو کبھی بھی ان کے کپڑوں کو دھوبی کے یہاں جاتے یا دھوبی کے یہاں سے آتے ہوئے نہیں دیکھے۔ بس جو کپڑے وہ جسم پر پہنے ہوئے تھے وہ گویا ان کی کھال ہو کر رہ گئے تھے اب اگر آپ ہم سے یہ پوچھیں کہ ان کپڑوں کا کیا رنگ تھا تو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصلی رنگ کا تو خیر حال معلوم نہیں لیکن کثرت استعمال سے وہ کپڑے رنگ بدلتے بدلتے اب جس ایک رنگ پر قایم ہو گئے تھے اس کو اصطلاح عام میں صافی کا رنگ کہتے ہیں، اسی طرح اگر آپ یہ دریافت کریں کہ ان کا لباس کس کپڑے کا ہوتا تھا یعنی تنزیب یا نین سکھ، تو اس کے متعلق عرض ہے کہ ہم نے میر صاحب کو ہمیشہ موٹا جھوٹا تنزیب تن کئے ہوئے دیکھا ہے جس پر مکھیوں کی نشست سے ہر وقت مختلف قسم کے نقش ونگار بنتے اور مٹتے رہتے تھے۔ البتہ ان کے کپڑوں کی خوشبو یا بدبو کے متعلق ہم کچھ بھی عرض نہیں کر سکتے اس لئے کہ یہ علم حاصل کرنے کی ہم کو کبھی جرأت نہیں ہوئی۔

میر صاحب کا دولت کدہ ایک بہت ہی ویران محلہ میں تھا جس کا بیشتر حصہ لکھوری اینٹ اور گارے کی شکل میں مکان کے کھنڈر میں نظر آتا تھا اور جو باقی رہ گیا تھا وہ بھی کوئی تاریخی کھنڈر معلوم ہوتا تھا لیکن میر صاحب کی ضروریات کے لئے ایک مختصر سی کوٹھری کافی تھی جس میں وہ اپنی تمام گرہستی کے ساتھ رہتے تھے اور باقی تمام مکان فی سبیل اللہ چھوڑ رکھا تھا۔ میر صاحب کی اس چھوٹی سی کوٹھری میں ایک تو تھی، وہ چارپائی جو شاہی زمانہ کے کھٹ بنوں نے اپنے ہاتھ سے بنی تھی حالانکہ اب وہ اپنی بوسیدگی کے اعتبار سے ٹوٹی ہوئی قبر معلوم ہوتی تھی لیکن میر صاحب اس حالت کو غنیمت سمجھتے تھے بہ نسبت اس کے کہ آج کل کے بدتمیز کھٹ بنے اس تاریخی چارپائی میں ہاتھ لگائیں۔ اُس چارپائی پر کچھ بستر تھا تو ضرور لیکن صحت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا تھا اور کن کن چیزوں پر مشتمل تھا۔ چارپائی کے علاوہ اس کوٹھری میں جس چیز کو نمایاں حیثیت حاصل تھی وہ حقہ تھا اس حقہ کے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے کہ میر صاحب کے دادا جان مرحوم ومغفور کو غدر کے زمانہ میں کسی شاہی محل میں پڑا ہوا ملا تھا اور وہ اب تک، نہایت حفاظت کے ساتھ محفوظ چلا آرہا تھا، میر صاحب نے تو بنظر احتیاط اس کو کبھی پانی سے تازہ تک نہیں کیا تھا اور نہ اس کا پانی سال سے پہلے بدلتے تھے البتہ ان کی چلمیں جب سے اب تک چار پانچ مرتبہ ضرور بدلی گئی تھیں اور اس میں بھی میر صاحب کی بے احتیاطی کو دخل نہ تھا۔ بلکہ ہوتا یہ تھا کہ جہاں میر صاحب کی آنکھ جھپکی اور حقہ الٹ کر زمین پر آرہا بس اسی میں چلمیں ٹوٹ گئیں چارپائی اور حقہ کے بعد تین کے سماوار کا نمبر تھا جو ہر وقت گرم رہتا تھا اور جس میں ہر وقت چائے طیار رہتی تھی، ان چیزوں کے علاوہ چاء کی پیالی، کوئلوں کی ٹوکری، کچھ کلہڑ، کچھ دونے، گلکسو کا ڈبہ جس میں خمیرہ تمباکو رکھا جاتا تھا، ایک اسٹول جس پر گول چینی کی پیالی، کاتبوں کی دوات کی طرح رکھی تھی، ایک آگ دھونکنے والی دفتی، کچھ آگ سلگانے کے لئے گودڑ، ایک آبخورہ، ایک گھڑا، ایک تانبچینی کا ڈونگا اور ایک دیاسلائی کی ڈبیا بھی تھی ان ہی تمام چیزوں کی میر صاحب کو ضرورت تھی اور ان ہی سے وہ اپنی ضروریات پوری کرتے تھے لیکن زیادہ تر توجہ اسٹول پر رکھی ہوئی پیالی کی جانب رہتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی زندگی اسی پیالی میں بند ہے۔

میر صاحب کا زیادہ تر وقت اسی گوشۂ عافیت میں گزرتا تھا لیکن ہر روز کم سے کم ایک مرتبہ آپ اپنے ایک دوست کے مکان پر ضرور جاتے تھے جہاں آپ کے تمام ہم مشرب یکجا ہو کر تھوڑا سا وقت دلچسپی کے ساتھ گزارتے تھے، اس اجتماع میں بڑے بڑے ملکی اور قومی، سیاسی اور معاشرتی، ادبی اور تمدنی، اخلاقی اور علمی مسایل پر بحث ہوتی تھی، واقعات حاضرہ پر رائے زنی کی جاتی تھی اور دُنیا کے اہم سے اہم معاملات نہایت غور و فکر کے بعد طے پاتے تھے اور اس انجمن میں میر صاحب کو وہی درجہ حاصل تھا جو کسی ذمہ دار کانفرنس کے صدر کو حاصل ہوتا ہے، ان کی رائے قطعی فیصلہ کن سمجھی جاتی تھی اور ان کے تبحر، تدبر اور تجربہ کاری کا تمام ہمعصروں پر بڑا اثر تھا اور واقعہ بھی یہی تھا کہ اپنے یارانِ میکدہ میں میر صاحب سب سے زیادہ کہنہ مشق اور سب سے زیادہ پُرانے افیونی تھے۔ ان باتوں کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ ہمارے میر صاحب کس پایہ کے افیونی تھے۔

میر صاحب کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے ہم نے ان کے ساتھ بہتر سے بہتر تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ انکی افیون کے اخراجات کا ٹھیکہ لے لیا جس کے بعد میر صاحب کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ ابھی تک دُنیا باوفا دوستوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ میر صاحب پر اس طرح قابو حاصل کر لینے کے بعد ہم نے ان کی خاص سوسائٹی میں بھی داخل ہونا شروع کر دیا اور نہایت خاموشی کے ساتھ اس نئی دُنیا کی سیر کرتے رہے۔ میر صاحب کا معمول تھا کہ اپنے دوستوں کے مجمع میں جاتے ضرور تھے، لہٰذا ہم نے بھی ان کے ہمراہ جانا شروع کر دیا اور وہاں جا کر صحیح معنوں میں ایک نئی دنیا دیکھی جس کمرہ میں اس کانفرنس کے اجلاس ہوتے تھے اس کے وسط میں ایک بڑا سا پتیلہ چولھے پر چڑھا رہتا تھا جس میں چائے دم ہوتی تھی اور اس پتیلے کے چاروں طرف میر صاحب کے تمام دوست حلقہ باندھ کر بیٹھے تھے اور سب کے سامنے کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور تھا، کسی کے سامنے چاء کی پیالی ہوتی تھی تو کوئی کلہڑ لئے بیٹھا ہوتا تھا کسی کے آگے حقہ ہوتا تھا تو کوئی اپنی عزیز از جان پیالی میں چٹکی ڈالے بیٹھا ہوتا تھا کسی کے ہاتھ میں طلسم ہوشربا کی کوئی جلد ہوتی تھی تو کوئی کھٹیوں سے شغل کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ مختصر یہ کہ ہر ایک کسی نہ کسی کام میں مصروف ضرور ہوتا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ اہم ترین معاملات پر تبادلۂ خیال کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ کسی نے کہا:۔ (ہر جگہ نون غنہ بڑھا کر پڑھئے)

"اماں بھائی غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں"

دوسرے بولے:۔ "ارے یار پھر کہاں ہم اور کہاں یہ صحبتیں مر کر چلے جائیں گے پھر ہم ہوں گے اور قبر کا کونا"

بسرے نے کہا:۔ "سچ ہے بھائی اللہ بس باقی ہوس"

چوتھے نے فرمایا:۔ "خدا معلوم کیا حشر ہو بڑے گناہ کئے ہیں"

پانچویں بولے:۔ "واللہ ہم سارو سیاہ بھی دُنیا میں کوئی نہ ہوگا نہ نماز کے نہ روزے کے آخر خدا کو کیا منہ دکھائیں گے بھائی اور چاہے جو کچھ کرو نماز ضرور پڑھ لیا کرو بڑی برکت ہوتی ہے اور سارے گناہ معاف ہو جائیں گے یہ نماز نہ پڑھنا تو جہنم کی سیر کرائے گا"

میر صاحب نے فرمایا:۔ "اماں لاحول ولا قوہ کیسی باتیں کرتے ہو خداوند کریم بڑا رحیم ہے، اماں وہ ہم کو نہ بخشے گا تو کیا فرنگیوں کو بخشے گا، بھائی ہم کلمہ تو پڑھتے ہیں، ان گنہگاروں کو دیکھو جو دُنیا کے گناہ کرتے ہیں اور پھر ہم پر بادشاہت کرتے ہیں مگر وہاں جا کر پتہ چلے گا"

اور صاحب کہنے لگے:۔ "کیا بات کہی ہے واللہ، مگر میر صاحب یہ انگریزوں کی شاہی بھی گاندھی نے کرکری کر دی سُنا ہے کہ اب لڑائی ہونے والی ہے"

میر صاحب:۔ "اماں جاؤ بھی، گاندھی بیچارہ کیا کرتا، وہ تو کہو کہ سرکار نے ڈھیل چھوڑ رکھی ہے نہیں تو توپ کے منہ پر باندھ کر اُڑا دیتی، سرکار سے کوئی کیا لڑے گا۔ ہزاروں بندوقیں، توپیں، تیر و کمان، تلوار سب ہی تو اس کے پاس ہیں

سرمہ کر دے، جو کوئی سر بھی اٹھائے، اماں آج چاہے تو توپوں سے سارے شہر کو اڑا دے۔ ہوائی جہاز سے آگ برسا دے ریلوں کو لڑا دے، موٹروں سے کچل دے، اماں ایک ہوائی جہاز ایسا ہے کہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ایک صاحب نے فوراً آنکھیں کھول کر فرمایا ارے ہاں بھائی میر صاحب خوب یاد دلایا، یار ان ہوائی جہازوں سے تو بڑی بے پردگی ہوتی ہے۔ سب پردہ دار عورتوں کو یہ لوگ دیکھتے ہوں گے۔"

دوسرے صاحب کہنے لگے :۔ "ہاں بھائی کل ہی کا ذکر ہے کہ ایک ہوائی جہاز میرے مکان پر نکلا مگر بہت نیچا تھا میں نے بھی لڑکا لنگڑ لے کر جو اس پر مارا تو قسم ہے آپ کے سر عزیز کی کہ بس ذرا سا بچ گیا نہیں تو زمین پر ہوتا اور ہڈی پسلی سرمہ ہو گئی ہوتی۔ میر صاحب نے تجویز پیش کی :۔ بھائی تو اب کیا کیا جائے عورتوں کو انگنائی میں نہ نکلنے دیا کرو یا ایک شامیانہ لے کر لگا دو۔"

اس کے بعد پردہ کا مسئلہ چھیڑ گیا اور پھر یورپ کی آزادی پر تبصرہ ہونے لگا، انگریزوں کی دولت کا ذکر ہوا اُن کی تندرستی اُن کی غذا، ان کے لباس اُن کی معاشرت، ان کی گندگی، ان کے کتوں، ان کی میموں، ان کے بچوں کا تذکرہ ہوا، بے فکری اور فارغ البالی کے موضوع پر دھواں دھار تقریریں ہوئیں ہندوستان کے افلاس پر اظہار افسوس کیا گیا، ہندو مسلم کشیدگی پر دیر تک بحث ہوتی رہی۔ سوراج کے امکانات پر تبادلۂ خیال ہوا، جنگ کے خیال کا اندیشہ ظاہر کیا گیا، جنگ کے ہولناک نتائج بیان کئے گئے اور پھر قرب قیامت کے وعظ کے بعد ایک صاحب نے تجویز پیش کی ہم سب نماز شروع کر دیں اور اب کی رمضان میں روزے ضرور رکھیں، افطاری کی فہرست مرتب ہوئی اور یہ دلچسپ کارروائی ایک صاحب کی چاء کی طرف متوجہ ہونے سے ادھوری رہ گئی جس کے بعد سب نے چاء نوشی شروع کر دی اور پھر وہی دور شروع ہوا جس کے ساتھ ساتھ کوئی تو اپنی خاندانی فیاضی کے قصے سناتا رہا، کوئی اپنے والد مرحوم کے کارنامے بیان کرتا رہا، کسی نے اپنی جوانی کی رنگین داستان چھیڑ دی اور میر صاحب نے اپنے خاص انداز بیان میں واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے محلات کا ذکر شروع کیا جو نہیں معلوم کہاں کہاں ہوتا ہوا الہ آباد کی نمائش پر آکر ختم ہوا۔ ایک صاحب جو دیر سے اپنے دونوں گھٹنوں میں سر دئے ہوئے بیٹھے تھے ذرا سا ابھرے اور سب کو داستان امیر حمزہ کی طرف متوجہ کیا جس کی سب نے تائید کی اور ایک صاحب نے شروع کر دیا ——— اور سب آنکھیں بند کر کے سننے لگے، وہ حضرت داستان پڑھ رہے تھے داستان کے ایک ایک فقرے پر ایکٹنگ بھی فرماتے جاتے تھے لیکن سامعین کا یہ حال تھا کہ رفتہ رفتہ سب کے سر گھٹنوں میں دھنسے جاتے تھے صرف داستان گو کی آواز کمرہ میں گونج رہی تھی اور سب پر ایک سکوت بلکہ موت کی سی کیفیت طاری تھی۔

رعایتی اعلان

من و یزداں — مذہبی استفسارات و جوابات — نگارستان — جمالستان — مکتوبات نیاز تین حصے — حسن کی عیاریاں

مذہب — فراست الید — مجموعۂ استفسار و جواب جلد سوم — قول فیصل — شہاب کی سرگزشت — نقاب اٹھ جانے کے بعد

میزان =

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول صرف چالیس روپیہ میں مل سکتی ہیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

کرۂ زمین کی آیندہ حکمراں قوم

(نیاز فتحپوری)

یورپ کا مشہور مصنف ایچ۔جی۔ ویلس نے ایک بار کہا تھا کہ اگر کبھی انسان کی سیادت کرۂ زمین پر ختم ہوگئی تو اسکے بعد جس قوم کی حکومت ہوگی، وہ قوم مکڑی کی ہوگی۔

مسٹر ویلیز سائنس داں شخص نہیں تھا لیکن ایک ماہر جس نے مکڑی کا پورا مطالعہ کیا ہے کہا ہے کہ ویلیز اگر سائنس داں نہیں تو پیغمبر ضرور تھا جس نے ایسی صحیح پیشین گوئی کی ہے۔

مختلف قسم کی مکڑیوں کے حالات کا جو مشاہدہ کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بلا کی ذہین مخلوق ہے اور انسانی دماغ مشکل ہی سے اس کی قوتِ ایجاد و اختراع اور انجنیری کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

جن ماہرین فن نے اُس کے جالے کا مطالعہ کیا ہے ان کا بیان ہے کہ بعض مکڑیاں اس قدر باریک جالا طیار کرتی ہیں کہ اگر خوردبین کے ذریعہ سے دو ہزار گنا بڑا کرکے اس کو دکھایا جائے تو وہ کھوٹے کے معمولی بال سے زیادہ موٹا نظر نہیں آسکتا، حالانکہ اگر انسانی بال کو اسی نسبت سے بڑا کرکے دیکھا جائے تو وہ ۶½ انچ موٹا نظر آئے گا۔ اس نازک و باریک جالے کی (جس کا قطر $\frac{1}{32000}$ انچ ہوتا ہے) مضبوطی کا یہ عالم ہے کہ انسان کی بنائی ہوئی رسّی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ایک پروفیسر کا بیان ہے کہ خود اسنے اسی جالے کے ذریعہ سے مینڈکوں، سانپوں چھپکلیوں اور چمگادڑوں کا شکار کرتے ہوئے مکڑی کو دیکھا ہے اور جس وقت کوئی بڑی مکڑی بھوکی ہوکر کسی تالاب یا حوض کی طرف شکار کو جاتی ہے تو چھوٹی مچھلیاں خوف زدہ ہوکر بھاگ جاتی ہیں۔

بیٹو یا میں ایک سانپ ہوتا ہے جس کی لمبائی تقریباً ایک فٹ ہوتی ہے، ایک مرتبہ دیکھا گیا کہ ایک مکڑی نے جس کا جسم مٹر سے کچھ بڑا تھا اُس کو اس بُری طرح جالے میں لپیٹ لیا کہ وہ بھاگ نہ سکا۔ مکڑی نے اس کی دُم کو بھی جالے میں لپیٹ کر مرکزی رشتہ سے باندھ دیا تھا اور منہ میں بھی بہت سا جالا بھر دیا تھا تاکہ وہ بالکل بے قابو ہوجائے۔

ایک بار چوہے کو جالے کے اندر تڑپتے ہوئے دیکھا گیا۔ سب سے پہلے سونے کی حالت میں اُس کی دُم کو جالے کے اندر لپیٹا گیا اور پھر جالے کے پھندے کے ذریعہ سے جو اس کے گلے میں ڈالا گیا تھا اوپر کی طرف کھینچ لیا گیا جہاں وہ میز کے نیچے جالے کے اندر بے قابو ہوکر لٹک گیا اور مکڑی کی خوراک ہوگیا۔

جالے کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس سے مچھلی کا جال طیار ہوسکتا ہے، چنانچہ نیوگائنا کے باشندے مکڑی کے جالے ہی سے مچھلی پکڑنے کا کام لیتے ہیں۔ یہاں ایک بڑی قسم کی مکڑی پائی جاتی ہے جو ۶۰ ۔ ۷ فٹ قطر کا جالا بنتی ہے اور چڑیوں کے پکڑنے کے لئے بڑے بڑے پھندے طیار کرتی ہے۔ یہاں کے وحشی ایک بانس لے کر جنگل میں گاڑتے ہیں اور اس کے سرے پر ایک آنکڑا سا لگا دیتے ہیں اور یہ آنکڑا گویا بڑے پھندے کا کام دیتا ہے اور مکڑی آکر اس پھندے سے اپنا جالا بننا شروع کردیتی ہے۔ جب جالا طیار ہوجاتا ہے تو لوگ بانس اکھاڑ کر لے جاتے ہیں اور اس سے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پانی اس پر اثر نہیں کرتا۔

مکڑی ہوا کی بڑی شائق ہوا اور گرمیوں میں اس کی بہترین تفریح یہی ہوتی ہے کہ وہ فضا میں جھولا جھولتی ہے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی بلند جگہ تین چار تانے جالے کے نیچے کی طرف ڈھیلے لٹکا دیتی ہے اور خود ان پر لٹک جاتی ہے، ہوا سے یہ تاگے اِدھر اُدھر اُڑتے ہیں اور وہ بھی ان کے ساتھ جھولا جھولتی رہتی ہے۔

مکڑی کی زندگی کا عجیب و غریب کارنامہ اس کا واقعۂ عشق و محبت ہے ۔ _____ جالا بننا، شکار کرنا اور تمام ایجاد و اختراع یہ سب ادہ مکڑی کا کام ہوتا ہے، نر بہت حقیر کاہل ہوتا ہے اس لئے محبت کے معاملہ میں بھی ادہ مکڑی ہی پیش پیش رہتی ہے اور اسی کی مرضی پر سب کچھ منحصر ہوتا ہے۔

مکڑی کا عشق ہمیشہ چاندنی رات میں شروع ہوتا ہے جس کی ابتداء اس کے مخصوص حرکات سے ہوتی ہے جسے رقص محبت کہہ سکتے ہیں۔ جب مکڑی (نر یا مادہ) رقص محبت کرتی ہوئی بڑھتی ہے تو دوسری مکڑیوں سے اس کا جسم مس کرتا ہے اگر دونوں نر ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو مارتے ہوئے گزر جاتے ہیں، لیکن جب نر اور مادہ کے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے تو تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو چھونے کے بعد اگر رشتۂ محبت منظور نہیں ہوتا تو دونوں علٰحدہ ہو جاتے ہیں اور اگر منظور ہوتا ہے تو پھر یہ رقص محبت دونوں کا ساتھ ساتھ شروع ہوتا ہے اور اس کو شادی سے پہلے کورٹ شپ کی رسم سمجھنا چاہئے جو کبھی طویل ہوتی ہے اور کبھی مختصر۔ کبھی اس نسبت کا نتیجہ شادی ہوا کرتا ہے اور کبھی افتراق۔ اس عہد الفت میں ان دونوں کا باہم مل کر گھومنا بہت لطف ہوتا ہے، کبھی دونوں گھنٹوں کے لئے خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے سے علٰحدہ ہو کر پھر مل جاتے ہیں اور ٹہلنے لگتے ہیں، ان میں باہم جنگ بھی ہوتی ہے اور صلح بھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ازدواج تک پہونچنے کے لئے وہ ایک دوسرے کا مطالعہ گہرائی کے ساتھ کر رہے ہیں، بعض مکڑے بھی مردوں کی طرح صرف عیاش و اوباش ہوتے ہیں اور ان کا میلان ادہ کی طرف کبھی سنجیدگی کے ساتھ نہیں ہوتا اور نہ شادی کرنا ان کا مقصود ہوتا ہے، بظاہر اس قسم کے مکڑے بہت متواضع، نہایت عمدہ رقص کرنے والے ہوتے ہیں اول اول ہر مکڑی ان کی طرف مائل ہو جاتی ہے لیکن بعد کو جب حقیقت کا علم ہو جاتا ہے تو اس سے احتراز ہونے لگتا ہے اور نر کسی اور مکڑی کی جستجو کرتا ہے

لیکن اس عشق و محبت کی داستان کا انجام اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے، یعنی جس وقت وہ کسی مکڑے (نر) کا انتخاب کر لیتی ہے اور وہ غریب اپنے انجام سے بے خبر مواصلت کو گوارا کر لیتا ہے تو مکڑی کی دعوت ولیمہ کا سارا سامان اسی کی جان ناتوان فراہم کرتی ہے۔ یعنی مواصلت کے بعد ہی مکڑی اس پر حملہ کرتی اور کھا جاتی ہے۔ بعض مرتبہ نر بھاگتا ہے اور پوری کوشش جانبری کے لئے کرتا ہے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتا اور لذت مواصلت کے بدلے اس کو اپنی جان کی قربانی پیش کرنا ہی پڑتی ہے۔

اگر آپ ادبی و تنقیدی لٹریچر چاہتے ہیں تو یہ سالنامے پڑھئے

اصناف سخن نمبر، قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول ۔ حسرت نمبر، قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول ۔ مومن نمبر، قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول
ریاض نمبر، قیمت [illegible] علاوہ محصول ۔ داغ نمبر، قیمت آٹھ روپیہ علاوہ محصول ۔ (جملہ صفحے ۲۵۰)
لیکن یہ سب آپ کو بیس روپیہ میں مع محصول مل سکتے ہیں، اگر یہ رقم آپ پیشگی بھیجدیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

اشارات وکنایات

(نیاز فتحپوری)

رات تھی اور تاریک، سکون تھا اور مطلق ۔ تاریکی و سکون کی شدت کے ساتھ میری قوت مشاہدہ و بصیرت بہت غائر و عمیق ہو جایا کرتی ہے ۔ دو بج چکے تھے، دنیا غافل سو رہی تھی اور میں تنہا گاؤں کے ایک جھونپڑے میں، گہرے سکون کی اس خاص آواز کو جسے کان نہیں صرف دماغ سن سکتا ہے، پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

فضا کے وسیع بسط میں ستارے اس طرح منتشر تھے گویا کہ وہ روشنی کے بے شمار قطرے ہیں جو سطح پر گر کر پھیل گئے ہیں، میں خاموش لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ کیا خدا کی ابدیت اسی احاطہ نہ ہو سکنے والی کائنات کا مفہوم ہے، کیا خدا کا وجود اسی لانہایت سے عبارت ہے اور کیا ازلیت اسی کا دوسرا نام ہے ـــــ دفعتہً ایک ستارہ ٹوٹا اور پہلے ایک سیدھا، پھر منحنی خط بناتا ہوا تیز روشنی میں تبدیل ہو کر فنا ہو گیا ـــــ فوراً اس مذہبی معلم کی طرف خیال منتقل ہوا جس نے کسی وقت یہ ذہن نشین کرا دیا تھا کہ جنھیں شہاب ثاقب کہتے ہیں۔ وہ اس گرز کی چنگاریاں ہیں جسے فرشتے شیطانوں کے سروں پر مارتے ہیں ـــــ۔ اس کے بعد ہی یورپ کے ایک گمراہ فلسفی کا مقولہ یاد آگیا کہ:۔ "دنیا عبارت ہے، خدا اور شیطان کے باہمی سمجھوتے" سے۔

میں ان دونوں خیالوں کے تضاد و اختلاف پر دیر تک دل ہی دل میں ہنستا رہا اور پھر سوچنے لگا کہ کیا انسان کی سرکشی کہیں جہل ہی کے ردعمل کا نتیجہ تو نہیں ـــــ اتفاق سے اسی وقت گاؤں کے اس مجذوب کی آواز کان میں آئی جس کی بات مشکل ہی سے کسی کے سمجھ میں آتی تھی۔ وہ مندر کے ایک ایک بت کو باہر نکال کر پھینکتا جاتا تھا، اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ:۔ "عقل سے کام لے کر خدا کا انکار، اس سے بہتر ہے کہ بے عقلی سے اس کا اقرار کیا جائے"۔ میں نے پاس جا کر اس سے پوچھا کہ:۔ "اگر بے عقلی سے بجائے اقرار کے انکار کیا جائے تو؟" اس نے مجھے دیکھا اور کہا کہ:۔ "یہ اپنی قسم کی بالکل پہلی بے عقلی ہوگی" اور پھر کام میں لگ گیا۔

کلیسا کا مقدس راہب میرے پاس آیا اور صلیب کو بوسہ دے کر تسبیح جیب میں رکھتے ہوئے بولا:۔ "نجات چاہتے ہو! تو دین مسیحی اختیار کرو اور یسوع کو خدا کا بیٹا مانو جس نے اپنے مقلدین کے لئے آسمانی بادشاہت کا وعدہ کیا ہے"۔ میں نے کہا:۔ "ہاں، تمہارا مذہب سچا معلوم ہوتا ہے، مجھے عیسائی بنالو"۔ اس نے خوش خوش مجھے اصطباغ دیا اور چلا گیا۔

ایک یہودی عالم آیا اور بولا:۔ "دین موسوی سے بہتر کوئی دین نہیں، اٹھ اور وہ راستہ اختیار کر جو بنی اسرائیل کو نجات دلانے والے پیغمبر نے بتایا تھا"۔

میں نے کہا:۔ "بے شک تمہارا دین سچا ہے اور مجھے موسوی ہونے میں کوئی عذر نہیں"۔

ایک مجوسی موبد آیا اور بولا:۔ "کیا زردشت نبی کی صداقت سے تجھے انکار ہے؟ کیا اس کی تعلیمات نجات انسانی کی ضامن

نہیں، اُٹھ اور میرے ساتھ چل کر آتشکدۂ مقدس میں تجدید ایمان کر۔"

میں نے کہا بے شک تمہارا نبی سچا نبی تھا اور مجھے اس کی تعلیمات کی صداقت سے انکار نہیں۔

ایک پنڈت اپنی پیشانی پر صندل کا بڑا سا قشقہ کھینچے ہوئے آیا اور بولا کیا تجھے ویدوں کے الہامی صحائف ہونے سے انکار ہے، کیا تجھے فلسفۂ ویدانت کی صداقت میں شک ہے۔

میں نے کہا۔" میں ویدوں کو صحائف آسمانی جانتا ہوں اور ویدانت کی حقانیت کا قایل"

بودھ مذہب کے مندر کا سب سے بڑا پجاری مجھ سے ملا اور بولا: "کیا بودھ مذہب کی تعلیم سے زیادہ کوئی اور تعلیم امن وسکون کا راستہ بتانے والی ہے"

میں نے کہا:۔"بے شک بودھ کی تعلیمات میں بڑی کشش ہے اور میں بودھ کو خدا کا پیغمبر جانتا ہوں"

دین محمدی کا ایک عالم آیا اور بولا:۔" کیا محمدؐ کی رسالت اور قرآن کی الہامی کتاب ہونے سے تجھے انکار ہے"

میں نے کہا:۔ " ہرگز نہیں"

چند دن بعد میں نے ان سب کو اپنے گھر بلایا اور ایک جگہ جمع کیا، لیکن اُن کی حالت یہ تھی کہ ایک کا منہ دوسرے کی طرف سے پھرا ہوا تھا اور سب کا دل غصّہ سے لبریز۔

میں نے اُن سے پوچھا "تم ایک دوسرے سے کیوں نہیں مل جاتے، کیا تم سب حق پر نہیں ہو" اُن میں سے ہر ایک نے برہم ہوکر کہا۔" نہیں میرے علاوہ سب غلط راستہ پر چل رہے ہیں اور گمراہ سے دوستی ناجایز ہے"

میں نے کہا:۔ " اگر میں کوئی ترکیب ایسی بتادوں جو تم سب کو ایک دوسرے کا بھائی بنادے تو اُسے مان لوگے" اُنھوں نے کہا " ہاں، بتاؤ"

میں نے کہا:۔" اچھا تو آؤ اور سب مل کر ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالو اور اس مذہب کا نام " محبّت" رکھو، جو تمام مذاہب کے اصول کو اپنی جگہ برقرار رکھتے ہوئے " اخوت عامہ " کی تعلیم دے"

یہ سُن کر ان میں سے ہر ایک دیر تک سوچتا رہا اور پھر وہ سب کے سب ایک آواز سے بولے کہ " یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن ہم ایسا نہیں کرسکتے، کیونکہ ہماری جماعت کے افراد ہم سے چھن جائیں گے اور ہماری معاش کی راہیں مسدود ہوجائیں گی" وہ یہ کہکر چلے گئے اور میں نے دیکھا کہ ایک طرف شیطان کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا اور دوسری طرف " انسانیت " رو رہی تھی۔

"کیا یہ آسمان و زمین، یہ وسیع کائنات، یہ بیشمار مخلوق، اور یہ نظام عالم آپ ہی آپ وجود میں آگیا؟ سورج کا روز ایک مقررہ وقت پر نکلنا، موسموں کا مخصوص حالات کے ساتھ رونما ہونا، چاند کا یکساں طور پر گھٹنا بڑھنا اور اسی طرح کے تمام نوامیس طبعی و مظاہر فطرت کیا اس امر کی دلیل نہیں کہ ان سب کا پیدا کرنے والا اور سنبھالنے والا کوئی اور ہے کیا ممکن ہے کہ کوئی چیز بغیر خالق کے اپنے آپ پیدا ہوجائے، کیا عقل انسانی باور کرسکتی ہے کہ دھواں اُٹھے اور آگ کا وجود نہ مانا جائے" ——— یہ تھا خلاصہ ان دلایل کا جو ایک عالم دین کسی ملحد کے سامنے بیان کر رہا تھا ———

میں ان دلایل کو سن کر ایک خاص قسم کے ایقان کی روشنی دل و دماغ میں محسوس کر رہا تھا اور خوش تھا کہ ملحد ان دلایل کی تردید کبھی نہیں کرسکتا۔

اُس نے مسکراتے ہوئے سر اُٹھایا اور بولا ——— " اگر یہ تمام چیزیں، یہ جملہ کیفیات ازخود پیدا نہیں ہوسکتیں

کے لئے خالق کا تصور ضروری ہے ——— تو بتایئے کہ خدا کو کس نے بنایا،
، از خود کیونکر پیدا ہوگیا ——— عالم دین نے یہ سن کر کہا کہ "اے بیوقوف، تو بالکل نہیں سمجھتا۔ خدا ازلی وابدی
اس کو کسی نے نہیں بنایا، بلکہ اس نے سب کو بنایا ہے، اس لئے تیرا یہ اعتراض بالکل غلط ہے"۔ ملحد نے کہا کہ:۔
پ جو آپ کا دعوےٰ ہے وہی آپ کی دلیل ہے۔ اگر آپ کسی کو از خود پیدا ہونے والا مان سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ
کائنات کو ایسا نہ مانیں اور اگر کائنات کے لئے یہ ممکن نہیں تو پھر خدا کے لئے اس کا امکان کیوں ہو؟"
میں یہ سن کر غصہ سے بیتاب ہوگیا اور عالم دین سے مخاطب ہوکر بولا:۔ "حضرت، یہ شیطان ہے اس سے گفتگو
، لاحول پڑھئے اور کہہ دیجئے کہ ہم نے خدا کو بلا کسی دلیل کے پہچانا ہے"۔ ملحد یہ سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور یہ
ہوا چلدیا کہ:۔
"اگر بے دلیل کسی بات کا ماننا درست ہوسکتا ہے تو دلیل کے ساتھ کسی بات کو نہ ماننا اور زیادہ درست ہے"۔
عالم دین نے مجھے دیکھا اور کہا:۔ "معاذاللہ، شیطان بھی کس کس طرح انسان کو بہکاتا ہے"۔
میں کبھی خاموش دیر تک سوچتا رہا کہ:۔ "کیا عقل انسانی واقعی دنیا کی کوئی گمراہی ہے"۔

بعض اہم کتابیں سلسلۂ ادبیات کی

روستانی لسانیات کا خاکہ ۔ جان تیمز کے مشہور پمفلٹ
یہ پروفیسر سید احتشام حسین کے قلم سے مع ایک لبسیط مقدمہ کے قیمت ۶ع
ل اور سمندر۔ پروفیسر سید احتشام حسین کا سیاحت نامہ امریکہ یورپ۔ للعہ
لعۂ غالب ۔ اثر لکھنوی۔ جسمیں نسخۂ حمیدیہ کے منتخب اشعار بھی شامل ہیں ۸ع
ان بین۔ اثر کے پندرہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ اقبال عکسیست۔ غالب وغیرہ
کے متعلق ..... قیمت ۸ع
ں کی مرثیہ نگاری ۔ اثر لکھنوی۔ میر انیس کے کمال شاعری
مرثیہ نگاری کے متعلق بعض غلط فہمیوں اور اعتراضوں کے جواب پر مشتمل ہے۔ ۸ع
عزل ۔ پروفیسر مسیح الزماں کی کتاب اردو غزل کے خصوصیات
م پر بہت بسیط گفتگو کی ہے ..... قیمت:۔ ۸ع
تنقید کی تاریخ ۔ پروفیسر مسیح الزماں۔ حالی سے پہلے کی اردو تنقید کا جائزہ ۶ع
دب میں، رومانوی تحریک ۔ از ڈاکٹر محمد حسن۔
سل اور ادبی روایات کے پس منظر میں ۸ع
دکی کہانی ۔ پروفیسر سید احتشام حسین کی زبانی بچوں اور بالغوں کیلئے۔ للعہ
بے تکلف ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کے سبکسیل طنزیہ مزاحیہ مضامین کا دلکش مجموعہ۔ ۸ع
یں قصیدہ نگاری ۔ ابو محمد سحر گورنمنٹ حمیدیہ کالج کی معرکہ آلارا تصنیف۔ ۸ع

ناول کی تاریخ اور تنقید ۔ سید علی عباس حسینی۔ ناول کی تاریخ و تنقید
اسکی خصوصیت، یورپ کی دوسری زبانوں میں ناول کے ارتقاء پر بھی بحث کیگئی ہے۔ ۸ع
اردو ڈراما اور اسٹیج ۔ ابتدائی دور کی مفصل تاریخ۔ (دو حصوں میں)
۱۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔ واجد علی شاہ اور رہس ———
۲۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج۔ امانت اور اندر سبھا ———
پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ——— قیمت:۔ ۸ع
آب حیات کا تنقیدی مطالعہ ۔ مصنفہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب
حضرت آزاد کی "آب حیات" پر اعتراضات کا جواب ..... قیمت:۔ ۸ع
رزم نامہ انیس ۔ مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ ساڑھے بارہ سو
بند کی بلند پایہ رزمیہ نظم، مراثی انیس کے بہترین اقتباسات..... قیمت:۔ ۸ع
روح انیس ۔ میر انیس کے بہترین مرثیوں، سلاموں کا مجموعہ ———
مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ..... قیمت:۔ للعہ
فرہنگ امثال ۔ مولفہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ فارسی و عربی
کے ۱۶۲، اقوال و اشعار، محاورات و فقرات کا ترجمہ، شرح اور محل استعمال۔ ۶ع
بیگمات اودھ ——— مصنفہ شیخ تصدق حسین ———
اودھ کی اکتالیس بیگموں کے تاریخی حالات ..... قیمت: ۸ع

منیجر نگار لکھنؤ

(جسونت رائے رعنا بلسوی)

حُسن کو ہونے لگا احساس جذباتِ جنوں　　اب خدا جانے محبت کیا سے کیا ہو جائے گی

اثر سے دور اتنا جذبۂ دل ہو نہیں سکتا　　مجھے جس سے محبت ہو وہ قاتل ہو نہیں سکتا

قدم کے ساتھ دل بھی ہے، نظر بھی، شوقِ منزل بھی　　بھٹک کر بھی تو میں گم کردہ منزل ہو نہیں سکتا

مآلِ شادمانی پوچھ کر پھولوں سے کیا لے گا　　یہ کیا کم ہے کہ صورت شادماں معلوم ہوتی ہے

چمن کو بارہا پھونکا ہے جس کی شعلہ تابی نے　　وہی بجلی چراغِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

مسافر کو نہیں ہوتا اندھیرا راہِ منزل میں　　طلوعِ صبح، گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

نہیں بھرتی طبیعت عمر بھر بھی ساتھ رہنے سے　　جدائی لمحے بھر کی بھی گراں معلوم ہوتی ہے

بدل جاتا ہے خود اندازِ شکوہ،　　اگر اُن کو پشیماں دیکھتا ہوں

مُبارک ہو حرم والوں کو بُتخانے کی بربادی　　اُسے عبرت سے کیا دیکھوں جسے دیکھا ہے حسرت سے

یات لکھنوی)

اُسے قرار بھی آئے تو کس طرح آئے
دلِ خراب کہ آسودۂ فغاں بھی نہیں

جہاں سکون میسر ہو سر کو ٹکرا کر
مرے نصیب میں وہ سنگِ آستاں بھی نہیں

ستم کے بدلے کرم سے اب آزمائش کر
جفا سے ترکِ وفا کا مجھے گماں بھی نہیں

مری نظر سے کبھی گلستاں کو دیکھ حیات
اگر بہار نہیں ہے تو یہ خزاں بھی نہیں

یل شارق نیازی)

رنگ تسکیں بھی نگاہِ غلط انداز میں ہے
یعنی اک نغمۂ خاموش بھی اس ساز میں ہے

دیکھ اے چشمِ تغافل تری پرسش کا جواب
نگہِ شوق میں ہے شوق کے انداز میں ہے

آفریں ہے لبِ خاموش پہ فریاد نہیں
جور کی داد ہے یہ شکوۂ بیداد نہیں

یہ سکوں یہ سکوت کا عالم،
آج کس درجہ سوگوار ہوں میں

(متین نیازی)

آج بھی ذوقِ نظر ہے تشنۂ تسکینِ شوق — جب نگاہیں چار موتی ہیں وہ شرما جائے ہے
اے نگاہِ ناز مجھ کو تیرا ہر فرماں قبول — کوششِ ضبطِ الم سے دل تو بیٹھا جائے ہے

دم انھیں کا ہے کہ طوفاں میں جلاتے ہیں چراغ — ہوش میں ہوتے جو دیوانے تو پھر کیا کرتے
تغافل کا مجھے شکوہ نہیں ہے — خدا کے واسطے قسمیں نہ کھاؤ

(قاسم شبیر نقوی۔ نصیر آبادی)

حسبِ مرضی غم کی دولت بھی اُسے ملتی نہیں — آدمی مجبور ہے۔ اور کس قدر مجبور ہے!؟
بس عقل کی شورش تک ہنگامۂ محفل رہا — جب رنگِ جنوں چھایا فتنہ نہ اُٹھا کوئی
میں یہ سمجھا کسی تقدیر میں ترمیم ہوئی — جب کبھی آپ کے ماتھے پہ شکن آئی ہے

(اکرم دھولیوی)

نظر میں کھنچ کر ارمانوں کے ویرانے چلے آئے — بہاروں کے یہ دن کیوں خون رُلوانے چلے آئے
سکونِ دل کہیں پھر ہو گیا مشکل تو کیا ہوگا — وہ ناحق خوابِ غم سے مجھ کو چونکانے چلے آئے
سنبھالو خود کو یہ ہے جادۂ عشق و وفا اکرم
کہاں اس راہ میں تم ٹھوکریں کھانے چلے آئے